انشائیہ

طنز — گونگا درد — مزاح

خاکہ

غیاث صدیقی

سنہ اشاعت ۱۹۸۳ء

تعداد اشاعت ہزار

طباعت نیشنل فائن پرنٹنگ پریس مچھلی کمان حیدرآباد

کتابت محمد عارف الدین

قیمت دس روپیے سکۂ ہند

بہ تعاون و تشکر اردو اکیڈمی حیدرآباد، اے پی

ناشر

ادبی سنگم پبلیکیشنز، کالی کمان حیدرآباد د

(ادارہ روزنامہ [illegible] گلبرگہ (کرناٹک))

ملنے کے پتے

- امجد صدیقی، مجاہد منزل (۲۲-۵-۲۲۲) کالی کمان حیدرآباد ۲ اے پی
- الیاس ٹریڈرس، شاہ علی بنڈہ، حیدرآباد ۲
- نیشنل بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد ۲

انتساب

جناب یدھ ویر جی — ایڈیٹر روزنامہ ملاپ حیدرآباد دکن

جناب سید وقار الدین صاحب — ایڈیٹر روزنامہ رہنمائے دکن حیدرآباد

جناب محمود انصاری صاحب — ایڈیٹر روزنامہ منصف حیدرآباد

کے نام

جن کے دفاتر ادبی سازشوں کے گڑھ نہیں، بلکہ ادیبوں، شاعروں
اور دانشوروں کے درمیان اتحاد، احترام اور
اخلاص کے جذبات پیدا کرنے کے مراکز ہیں۔

احقر العباد

غیاث صدیقی

مصنف کی تصنیفات، تالیفات اور تراجم

آواز کا رنگ	(شعری مجموعہ)	۱۹۷۳ء	۱۵ روپیہ
قفس رنگ	(شعری مجموعہ)	۱۹۷۶ء	۱۵ روپیہ
نیلم کے پنکھ	(تلگو نظموں کا اردو ترجمہ)	۱۹۷۲ء	۷½ روپے
گونگا درد	(انشائیے اور خاکے)	۱۹۸۳ء	۱۰ روپے
نیلم کے پنکھ	طبع دوم	۱۹۸۰	۹ روپے

زیر طبع کتب :-

دستاویز شعری مجموعہ

رنگ مالا شعری مجموعہ (دیوناگری رسم الخط میں)

قطب النساء بیگم محفوظ کی حیات اور کارنامے (تحقیق)

دکن کے ممتاز ہم عصر (شاعر، ادیب، نقاد) "

غیاث صدیقی، شخصیت اور فن از [illegible] ایم اے (عثمانیہ)

گونگا درد میں شائع شدہ ادبی مواد میں، نام، کردار، مقام واقعات سبھی فرضی ہیں۔ حقیقی افراد، مقامات، واقعات سے ان کی مطابقت محض اتفاقیہ ہے۔ پبلشر یا مصنف پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

ترتیب

۱۔ تعارف
۲۔ دو باتیں
۳۔ سالی ۱۳
۴۔ شاعروں کا قبرستان ۱۹
۵۔ ایک سیماب صفت دانشور ۲۷
۶۔ ایک شاگرد شاعرہ ۳۵
۷۔ تصنیف کا ردِ عمل ۴۴
۸۔ ادبی ڈکٹیٹر ۵۲
۹۔ سورج مکھی ۶۰
۱۰۔ پڑوسن ۶۶
۱۱۔ کلب کی ایک رات ۷۴
۱۲۔ مس کلاوتی انصاری ۸۰
۱۳۔ [illegible]
۱۴۔ ناگوار و ناگزیر ۹۳
۱۵۔ تاثرات ۱۰۱ جناب حامد علی عباسی صاحب، محترمہ ڈاکٹر [illegible]
ڈاکٹر یوسف سرمست صاحب، ڈاکٹر زینت [illegible]

پیالہ زہر کا پی کر زبانِ حق کھولو
جو مصلحت سے ہے خاموش وہ بھی جھوٹا ہے

غیاث صدیقی

تعارف

گونگا درد، جناب صدیقی کے انشائیوں، طنزیہ مضامین
اور خاکوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں بلند آہنگ نقارے اور تیز شہنائی کی
کیفیت نہیں، تبسم زیر لب اور آہستہ آہستہ پھیلتی ہوئی چاندنی کی
بہار ہے، یہی اس مجموعے کی امتیازی صفت ہے۔ اور یہ صفت
بڑی قابلِ قدر ہے۔

ہمارے ملک میں غم و غصہ، رونا بسورنا، چیخ پکار، وعظ و پند تو
بہت ہے لیکن مہذب انسان کی دوستی جس میں اردگرد کے لوگ ہی نہیں
خود اپنی ذات بھی نشانہ ہو کم ہی ملتی ہے۔ یا لوگ یا تو ایسی طنز پر اتر
آتے ہیں، جو تیزاب بن جاتی ہے، یا ایسے مسخرے پن کے کھیل پر جو مداری
کا کرشمہ معلوم ہوتا ہے، پُر لطف خیال، زندگی کے تضادات، ظاہر و باطن
کا فرق، شخصیت کے اتار چڑھاؤ، دلچسپ واقعات کے پہلو

[illegible] کی [illegible] ... السم یہ لکشیہ کہ ہم [illegible] آتی ہے۔

میں نے اس سے پہلے غیاث صدیقی صاحب کا کوئی مضمون نہیں پڑھا
تھا۔ اس دہائی شعر و نظم میں مزاح نگاری کے جو نمونے سامنے آئے ہیں
وہ نظر سے گزرتے رہے ہیں، خود حیدر آباد میں زندہ دلان حیدر آباد کا غلغلہ ہے
مجھے ان مضامین کو پڑھ کر بہت لطف آیا۔ غیاث صدیقی اپنی بات
اپنے اپنے لہجے میں شروع کرتے ہیں۔ جزئیات کی مصوری پر قدرت رکھتے
ہیں۔ ایک ایک اینٹ رکھ کر عمارت بناتے ہیں، اور مجموعی تاثر یہ ہوتا
ہے کہ ایک فن پارہ وجود میں آیا ہے۔ اس مجموعے میں جہاں استاد،
شاعروں کا قبرستان، سالی، تصنیف کا ردِ عمل، پڑوسن، ادبی ڈکٹیٹر
ایک شاگرد شاعرہ، ایک سیماب صفت دانشور اور کلب کی ایک رات
جیسے [illegible] مضامین ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ان میں کچھ جانے پہچانے اشخاص
اپنے مناسب رنگ آمیزی کے ساتھ مواد فراہم کرتے ہیں۔ اہم بات
یہ ہے کہ زخم پہنچانا یا زک دینا مقصود نہیں، تضادات اور عجائبات سے
لطف اٹھاتا ہے۔ غیاث صدیقی کے یہ مضامین پڑھ کر فرحت اللہ بیگ
اور پطرس کی لطیف نگارش یاد آتی ہے۔ چلتے چلاتے اور باتوں باتوں
میں بڑی نفیس اور گہری طنز بھی کر جاتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

"ہندوستانیوں خصوصاً دکنیوں کو بچپن سے ہی ماں باپ جو پہلا
سبق [illegible]

* "منافع کا ہر سال تو سالی کے لئے ہوتا ہے، خسارے کا سال تو ماں باپ کے لئے ہوتا ہے۔ سالی لب سوز، لب ریز اور لب بند بھی ہوتی ہے"
* "پکچر نہیں دیکھی، کلب نہیں گئے، ایک مشاعرہ ہی کرا لیا۔"
* "محترمہ قطعاً مریضہ نہیں بلکہ میں خود نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہوں"
* "بچیوں کی استانیوں نے کہیں سایہ دار درخت بن کر کہیں ٹھنڈی چھیل بن کر لودھی بھائی کی مدد کی ہے"
* "بارہ سال تک میں نے کامنی کوشل کا چہرہ اور ساغر کی کھنک کو ایک ساتھ رکھا تھا لیکن یہ خواب ٹوٹ گیا۔"

طنز و مزاح ایک طور پر تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔ ادبی ڈکٹیٹر اچھا خاصہ شروع ہوا تھا، آخر میں غیاث صاحب پٹری سے اتر گئے ہیں۔ ایک سیماب صفت دانشور کے آخر میں بھی موڈ بدل جاتا ہے۔ مگر یہ خاکہ ہے اور شخصیت کی دھوپ چھاؤں کو ظاہر کرتا ہے ہمارے کچھ شعرا کی نفسیات، ترقی پسندی اور جدیدیت کی آویزش، ادب اور صحافت میں اشتہار بازی، پروپیگنڈے کی حکومت، غرض غیاث صاحب نے اس دور کی بہت سی دلچسپ باتوں کو پر لطف انداز میں پیش کر کے ہمارے لئے مسرت اور بصیرت کا بہت کچھ سامان فراہم کیا ہے۔ ان کے یہاں عشق کی وہ جست نہیں جو سارے مراحل پلک جھپکتے میں طے کر دے، بلکہ وہ لطیف اور نرم اور دلکش راگنی ہے، جو رفتہ رفتہ

انسان کو اپنے ساتھ بہالے جاتی ہے۔ اور وہ اس دلچسپ سفر سے بہت کچھ حاصل کر لیتا ہے۔
میں غیاث صدیقی صاحب کو اس مجموعے کی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں، اور امید کرتا ہوں کہ ادبی حلقوں میں اس کا مناسب خیر مقدم ہوگا۔

سرسید نگر، علی گڑھ
۶ فروری ۱۹۸۲ء

(پروفیسر) آل احمد سرور

دو باتیں

● ـــ مسز خاں مرحومہ صنعت و حرفت کی تربیت میں مہارت رکھتی تھیں۔ آج بھی ان کی سینکڑوں شاگرد خواتین سارے ہندوستان میں اپنے فنون کی روشنی بکھیر رہی ہیں۔ غیاث صدیقی کو ان کے داماد کی حیثیت سے میں جانتا ہوں۔

● ـــ ۱۹۵۳ء میں موصوف نے ماہ نامہ "سیوا" میں (جو خود ان کی ادارت میں شائع ہوتا تھا) ایک طنزیہ مضمون "اور ـــ وہ مسکراتی رہی" لکھا تھا۔ ماہ نامہ "سیوا" کی مجلس ادارت، ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب، پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب، پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب، پنڈت ونشی دھر ودیا لنکار صاحب اور جہاں بانو نقوی صاحبہ پر مشتمل تھی۔

● ـــ ۱۹۷۲ء میں ممتاز تلگو شاعر شری ششتندر شرما کی بیس جدید تلگو نظموں کا اردو ترجمہ "نیلم کے پنکھ" شائع ہوا تو، ڈاکٹر محمد حسین خاں، ڈاکٹر وحید اختر اور ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی نے اس کو بہت سراہا اور اس کی اشاعت پر غیاث صدیقی کو مبارک باد دی۔ یہ تخلیقی ترجمہ اشاعت کے ایک سال کے اندر ہی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا ہے۔

- ۱۹۷۳ء میں غیاث صدیقی کی طبع زاد نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "آواز کا رنگ" شائع ہوا تو آندھرا پردیش اردو اکیڈمی سے انعام دیا۔
- ۱۹۷۶ء میں غزلوں اور نظموں پر مشتمل "تعفس رنگ" شائع ہوا تو آندھرا پردیش اور اتر پردیش کی اردو اکیڈیمیوں نے انعامات دیئے۔
- ۱۹۷۸ء میں جناب وہاب عندلیب (لکچرار اردو) نے "غیاث صدیقی شخصیت اور فن" لکھ کر غیاث صدیقی کی شاعرانہ صلاحیتوں پر روشنی ڈالتے کے علاوہ موقر نقادوں، ادیبوں۔ اور دانشوروں کے تاثرات، تبصرے اور غیاث صدیقی کی نثر (انشائیہ، طنز و مزاح اور تنقید وغیرہ) کے نمونے بھی پیش کیے۔
- غیاث صدیقی نے "گونگا درد" کے نام سے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین، خاکے اور انشائیے لکھے ہیں، اس میں ان کی باغ و بہار تحریریں ہیں، جو صفحۂ اول سے آخر تک دلچسپ اور پُر لطف ہیں، موضوعات اچھوتے ہیں، نئے نقطۂ نظر سے لکھے، نئے اسلوب نگارش سے مزین ہیں۔ ان کا مزاح زیر لب تبسم ہے اور ان کا طنز، گلاب کے کانٹوں کی چبھن کا احساس دلاتا ہے "غم و غصہ میلا ہو" اور "شاعروں کا قبرستان" اردو طنز نگاری کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ خاص و عام میں بہت جلد مقبولیت کی سند حاصل کرلے گا۔

خواجہ عبد الغفور
ایچ، سی، ایس

حیدرآباد۔

ہندوستانی سماج میں اور اردو زبان میں سالی سے زیادہ خوبصورت
کوئی لفظ مشکل ہی سے ملے گا۔ سالی تلفظ میں نرالی دودھ کی پیالی اور مقدار سے
سالی ہو تو پھر کیا پوچھنا، سالی کا نام لیتے ہی زبان کی جڑ تک میٹھی ہو جاتی ہے —
دراصل سالی مختصر، مفید اور مقدس بھی ہوتی ہے۔
مختصر اس طرح کہ اگر آپ کی سالی کا نام "ماہ جبین" ہو اور وہ آپ کی
بیوی سے عمر میں بڑی ہو تو آپ نہایت آسانی سے "جبین آپا" کہہ سکتے ہیں،
اور اگر عمر میں چھوٹی ہو تو آپ بلا تکلف ماہ جبیں کا مخفف "جم" کہہ سکتے ہیں
کتنا مختصر نام ہے۔
اس طرح کہ آپ سسرال میں مہمان ہیں اور آپ کو کوئی چیز بازار
سے منگوانی ہو تو سالی کے سامنے جیب میں ہاتھ ڈالیے وہ فوراً آپ کو

روک دے گی اور اسی وقت آپ کی فرمائش کی تکمیل ہو جائے گی میز ہو دستر خوان ہو یا چوکی ہو، وہ بڑھ بڑھ کر ایک سے ایک بڑھیا ڈش آپ کی رکابی میں انڈیلتی جائے گی۔ میٹھی میٹھی باتیں بھی کرتی جائے گی۔ مزے مزے کے سالنوں اور لذیذ میٹھوں سے خاطر بھی کرتی جائے گی۔ سالی لب سوز لب ریز اور لب بند بھی ہوتی ہے۔

مقدس اس طرح کہ یہ آپ کو بھائی کہے گی اور آپ اس کو اپنی حقیقی بہن سے زیادہ پیار کریں گے۔ حقیقی بہنوں کو تو بچپن ہی سے زبردستی پیار کرنا پڑتا ہے اور اس پیار کو فرض نماز کی طرح یا قرض کا بوجھ جان کر ادا کرنا پڑتا ہے۔ جس میں ماں باپ کا خوف، سماج کا ڈر اور استاد کی گھرکیاں بھی شامل ہوتی ہیں۔

سچا پیار جو دل سے کیا جا سکتا ہے، وہ صرف سالی ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ نہ اس کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری آپ پر ہوتی ہے نہ اس کی شادی کا بوجھ آپ کے سر ہوتا ہے۔ اس لئے سالی ایک گوارا بہن ہوتی ہے، حقیقی بہنوں سے زیادہ دل دار و حق دار، محلے میں ایک خوش قسمت حکیم شمسی رہتے تھے۔ نک چڑھے اتنے کہ ناک پر مکھی کو نہیں بیٹھنے دیتے لیکن سالی کی شرارت کو پسند کرتے تھے۔ ایک مرتبہ تو اسی سالی نے حکیم صاحب کے سیاہ دروازے پر چاک پیس سے یہ شعر لکھ دیا تھا۔

اب یہ جلتا ہو تو شمسی کی دوا کھا کے دیکھ

[illegible]

پہلے تو وہ شعر پڑھ کر [illegible] ہو گئے لیکن جب معلوم ہوا کہ [illegible]
شعر اُن کی چہیتی سالی نے لکھا تھا تو ہنس کر خاموش ہو گئے ۔ اور کہنے لگے ۔

"بڑی شریر ہے سالی"

سالی کا رشتہ ، ساچق اور مہندی کی رسموں سے شروع ہوتا ہے ۔ دولھا بھائی کو پہلے ہی دن سالی کا رسمی طور پر غلام بن جانا پڑتا ہے ۔ انگلی چھڑانے کے لئے روپئے نذر کرنے پڑتے ہیں ۔ پھر شادی کے دن بھی سالی دولھا بھائی سے دھنگانا وصول کرتی ہے ۔ جوتے چراتی ہے ، انعام لے کر واپس کرتی ہے ۔ چوتھی کی شب پان کے بیڑے میں دولھا بھائی کو مرچ کھلا کر قہقہے لگاتی ہے ۔ اور جب چوتھی کھیلی جاتی ہے تو دولھا بھائی کو پھولوں کی چھڑیوں سے مارتی ہے ۔ اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ ان تمام نازک مراحل سے گذرنے کے بعد سالی کو کیسے بھلایا جا سکتا ہے ۔

حقیقی بہن کی تعلیم و تربیت سے لے کر بیاہ تک کی ذمے داری بھائی کے سر ہوتی ہے ۔ اور اگر بہن کی شادی کسی جواری یا کسی علت میں گرفتار شاعر سے ہو جائے تو پھر بھانجے بھانجی کی پرورش کی ذمے داری اور ان کے روشن مستقبل کا بوجھ بھی بد نصیب بھائی کے شانوں پر آپڑتا ہے اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ بہن اور سالی میں کون زیادہ پسندیدہ کہلائی جا سکتی ہے ۔ اگر بیوی اور سالی مغربی فیشن کی دلدادہ نکلیں تو پھر سمجھئے کہ بہن کا تصور تک بھائی کے لئے "مجرم" بلکہ "گناہ" بن جاتا ہے ۔ سر پہ گھونسلا جیسا جوڑا باندھ کر پرفیوم میں بسی ساڑیوں اور بے آستین بلاؤزوں

میں بیوی اور سالی کو ساتھ لے کر آپ سینما جا رہے ہوں تو راہ میں آنے والی بہن، کباب میں ہڈی کیوں نہ لگے۔ بہن تو بہن، ماں بھی اس وقت قابلِ توجہ نہیں رہتی۔ تنخواہ کا چوتھائی حصہ حسین بیوی اور نمکین سالی پر ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ایصالِ ثواب جان کر خرچ کرنا دانش مندوں کا کام ہے ماں بہن کا کیا ہے جو دو، کھا لیں گی، جو لاؤ پہن لیں گی، ان کا کام تو پکانا، کپڑے دھونا، گھر کا کام کاج کرنا ہوتا ہے۔ آخر کو بہن، بھائی کے گھر میں کام کاج نہیں سیکھے گی تو پھر کہاں سیکھے گی۔ سسرال جائے گی۔ اور وہاں کام کاج میں پیچھے رہے گی تو خواہ مخواہ بھائی بھاوج کا نام رسوا ہوگا۔

سالی کا کیا ہے، بے چاری مہینے میں دو ایک مرتبہ آتی ہے۔ اس کے لئے مرغ یا مچھلی پکائی جائے۔ فیرنی یا پڈنگ بنائی جائے تو ایسی کونسی قیامت آجائے گی۔ ماں بہن جتنا روز کھا جاتی ہیں کیا مہینے میں دو دن سالی کی میزبانی کے برابر خرچ اٹھتا ہے، اس پر ماں بہن کا دکھ درد، کپڑا لتا، آخر کو یہ سب کچھ بھی تو برداشت ہی کرنا پڑتا ہے۔ شادی کے بعد یہ پہلی عید آئی ہے اگر سالی کو کپڑوں کا ایک نیا جوڑا بنا یا گیا تو گھر والوں سے لے کر محلے والوں تک کے منہ بگڑ گئے۔ ساری زندگی ماں بہن کی خدمت میں گذار دی۔ سالی کی ایک دن کی خوشی سب کو ناگوار ہے۔

ہر سال ماہ شعبان میں والد مرحوم کی قبر پہ پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ قورمہ روٹی پر فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ اس سال اگر خسر مرحوم کی برسی کی تو ہر ایک کا منہ بگڑ گیا۔ محلے کا ہر شخص کہنے لگا کہ۔۔۔۔۔

"ہاپ کی بربادی میں قورمہ اور غصہ کی برکت میں بریانی!"

یہ نہیں دیکھتے کہ بیوی، ساس اور سالی کی خاطر پہلی مرتبہ یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے، گھرانے کی ناک بھی تو رکھنی پڑتی ہے۔

بے چاری سالی نے رو رو کر منہ اٹھا لیا ہے۔ رشتہ داروں کی تنقید کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ کیا خوب صورت ہونا، تعلیم یافتہ ہونا، فیشن کرنا، پکچر دیکھنا کوئی جرم ہے۔ آخر سالی کا بھی کوئی حق ہوتا ہے۔

"ایک تاجر صاحب تو کہتے ہیں کہ منافع کا [illegible] سال، سالی کا سونا ہے، خسارے کا سال تو [illegible] سونا ہے۔"

آج کل [illegible] اور رشتہ کرنے سے پہلے ہی دریافت کر لیتے ہیں کہ کیسی [illegible] جائے گی۔ شرط ایک عدد سالی کی ہے۔ سالی نہ ہو تو شادی بلکہ زندگی بے کار۔

ایک صاحب ہمارے گھر آئے، کپڑے نئے نئے لیکن چہرے پہ مسکین غم کے آثار۔ یہ تضاد ہماری سمجھ سے باہر تھا۔ دریافت کرنے پر [illegible] "بھائی صاحب دو ماہ قبل میری بیوی کا زچگی میں انتقال ہو گیا تین چھوٹے بچے چھوڑ کر وہ رخصت ہو گئیں۔" اتنا کہہ کر موصوف آبدیدہ ہو گئے۔ ہم نے صبر کی تلقین کی۔ موصوف کہنے لگے۔ "صبر ہی تو کیا دو ماہ تک۔"

سارے رشتہ دار اور محلے والے بضد ہو گئے کہ آخر بیوی کے بغیر زندگی کیسے گزارو گے، بچے بھی چھوٹے ہیں، ادھر دفتر کو جانا۔

اُدھر بچوں کا خیال رکھیں گے۔" اظہر اپنی جانِ ناداں پر کب تک ظلم کریں گے
آپ؟ پہلی فرصت میں خسر صاحب کے پاس اپنی چھوٹی سالی کے لیے پیام
بھجوا دیجئے۔ وہی ایک بچوں کی صحیح ماں بن سکتی ہے۔" پھر بولے۔" آخر
کو سب لوگوں نے مل کر کل شام میرا عقد چھوٹی سالی سے کروا کر ہی دم لیا"

ہم نے فوراً کہا۔" بھائی صاحب! یہ بہت اچھا ہوا آپ نے
گھر کی دیوار گھر ہی میں گرالی۔"

شاعروں کا قبرستان

کسی محفل میں پچاس شاعر ہوں تو بھی بشیر بھائی واحد سامع ہوتے
ہیں۔ ایسے ہی ایک مشاعرے میں میں بھی شریک تھا۔ مشاعرہ تین بجے رات
رات کو ختم ہوا اور میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ سمنٹ روڈ پہ آتے ہی پہلی
نظر بشیر بھائی پر پڑی۔ میرا ہاتھ بڑے خلوص سے تھاما اور مجھے ایک ایرانی
چائے خانے لے گئے۔ رات کے تین بجے نہاری اور شیرمال سے میری خاطر
کی اور گرم گرم چائے کی کپ میں، میں ان کے احسان تلے ڈوب گیا۔
بشیر بھائی، شاعروں کو کھلانے پلانے کی حد تک ہی محدود نہیں
ہیں۔ شاعروں میں آئے دن مختلف مسئلوں پر لڑائیاں بھی ہوتی ہیں، لڑائی
اور جھگڑا اس دانشور طبقے کی بین الاقوامی بانی بھی ہے۔ اور پیدائشی حق بھی۔
اپنے مادری زبان کے کنویں میں رہنے کے حق سے کم از کم اردو کے شاعر

دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہیں)

ایک مرتبہ بشیر بھائی نے مجھ سے بڑی معصومیت سے بے ساختہ لفظ "انا" کے معنیٰ دریافت کیے۔ میں نے کہا خیر تو ہے، آخر آپ کو اس "انا" سے کیا غرض ہے؟۔

"کہنے لگے میں اردو کے کسی شاعر سے بھی گفتگو کرتا ہوں تو دس منٹ کی گفتگو میں وہ بڑی تمکنت سے "انا" کا لفظ بیس مرتبہ استعمال کرتا ہے۔ میں نے کہا۔

"بشیر بھائی، خدا کا شکر ادا کرو کہ آپ کو صرف "انا" سے سابقہ پڑا ہے۔ بعض صورتوں میں آپ کو "غنا" سے بھی واسطہ پڑ سکتا ہے اور یہ غنا آپ کو "فنا" کا درجہ عطا کر سکتا ہے۔

بشیر بھائی اکثر مجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ حیدرآباد میں اُردو کا سب سے بڑا شاعر کون ہے۔ بھلا ان کو میں کیا جواب دے سکتا ہوں۔ جب کہ میں خود بھی شاعر ہوں۔ وہ تنگ آکر کہتے ہیں کہ ایک صاحب خود کو سب سے بڑا شاعر اس لئے سمجھتے ہیں کہ ان کی عمر اکثر شاعروں سے زیادہ ہے۔

ایک اور حضرت خود کو سب سے عظیم شاعر اس لئے جانتے ہیں کہ اُردو کے ایم اے ہیں۔ ایک اور شاعر نے اپنی عظمت کی بنیاد اس پر رکھی ہے کہ وہ سارے ہندوستان میں کل ہند مشاعرے سب سے زیادہ پڑھتے ہیں۔ ایک اور صاحب ہیں جن کا ادعا ہے کہ ان سے زیادہ معاوضہ آج تک کسی اور شاعر کو نہیں ملا۔ ایک صاحب کو اپنی عظمت اپنے مقبول عام ترنّم میں نظر آتی ہے

ایک اور محترم ایسے ہیں جن کا ادعا ہے، چونکہ ہر مشاعرے میں سب کے
بعد اُن کو پڑھایا جاتا ہے اور مشاعرے کے ہر اشتہار میں ان کا نام سب سے
پہلے شائع کیا جاتا ہے، اس لئے سب سے بڑے شاعر وہی ہیں۔ ایک اور
صاحب ہیں جو اپنے تئیں فراق اور فیض سے بھی بڑا شاعر سمجھتے ہیں، محض
اس لئے کہ ان کی غزلیں کچھ شبیہ گانے والیاں اور گانے والے گا چکے ہیں،
اور وہ بیش بہا نغمے ریکارڈوں میں اسیر ہیں۔

ایک شاعر اور ہیں جن کو اپنی عظمت کا یقین اس بات پر ہے کہ...
کلاسیکی شاعری، ترقی پسند شاعری اور جدید شاعری کے فرق و امتیاز کو
ان کے علاوہ کسی اور نے نہ سمجھا ہے اور نہ برتا ہے۔ ایک اور شاعر بھی عظمت
کے مرض میں مبتلا ہیں۔ ان کو خود پر استاد شاعر ہونے کا یقین ہے۔ بے شک
ان کے حلقۂ تلامذہ میں ہر پیشے، ہر سطح اور ہر جنس کے شاعر موجود ہیں جو اُن
کی استادی کی ڈفلی پیٹتے رہتے ہیں۔

ایک اور شاعر ہیں جن کے گھر قدرت نے اپنی مہربانی سے ایک مئے بار
عطا کیا ہے وہ بے چارہ تو منکسر المزاج ہے، لیکن وہاں پہنچ کر اردو کا نقاد اور
شاعر اسکاچ وہسکی کے چوتھے پیگ پر اپنی اپنی مادری زبان میں اُس کو
ہندو پاک میں سب سے بڑا شاعر بنا دیتا ہے ——— غرض عظمت کے
ان مختلف معیاروں نے بشیر بھائی کو بہت پریشان کر رکھا ہے۔ اور وہ صحیح
فیصلے پر پہنچنے سے قاصر ہیں۔ لیکن کسی عظیم شاعر کے لئے جو ضروری اور
مشترک اقدار ہیں ان کا اندازہ بشیر بھائی کو ایک حد تک ہو چکا ہے۔ مثلاً

کے طور پر عظیم شاعر کے لئے ضروری ہے کہ اس کے بال الجھے ہوئے ہوں۔ شراب اور سگریٹ مانگ کر پیتا ہو۔ ترنم کا ماہر ہو۔ خود ستائی اور شیخی کے فن سے واقف ہو، کسی اخبار کے اڈیٹر کا یا اس کے کسی چمچے کا منظور نظر ہو۔ اپنے سوا ہر شاعر کی تضحیک ایڈیٹر کے کمرے میں کرتا رہے۔ بشیر بھائی بہ جبر و اکراہ یہ سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں پھر بھی شاعروں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔

ایک روز علی الصبح بشیر بھائی تشریف لائے اور اطلاع دی کہ گزشتہ شب فلاں شاعر کا انتقال ہو گیا۔ رات ہی کو اردو کے ایک ادارے کی جانب سے چار سو روپے مرحوم کے گھر تجہیز و تکفین کے لئے بھجوا دیئے گئے تھے۔ ہم سب مطمئن تھے کہ مسئلہ حل ہو گیا لیکن صبح کو معلوم ہوا کہ مرحوم شاعر کی چار بیویاں تھیں، اور ہر ایک نے سو سو روپے آپس میں تقسیم کر لئے ہیں، تدفین کا مسئلہ جوں کا توں پڑا رہ گیا ہے۔ بشیر بھائی آگے بڑھے اور مرحوم کی آخری خدمت بھی انجام دے دی۔

بشیر بھائی بڑے قاعدے کے آدمی ہیں۔ ہر کام کو سلیقے اور قرینے سے تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ اب ان کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ شاعر زندگی میں تو متحد نہ ہو سکے، ایک دوسرے سے قریب نہ ہو سکے۔ کم از کم مرنے کے بعد ان کو ایک دوسرے کے قریب دفن کیا جائے۔ یہ سوچ کر انھوں نے اپنی افتادہ زمین سے چار سو مربع گز کا ایک خطہ علیحدہ کر کے اس کے اطراف چار دیواری کھنچوا دی۔ اس میں ایک مختصر سا سائبان اور ایک چھوٹا سا کمرہ بھی بنوا دیا۔ سائبان اس قدر طویل و عریض تھا کہ وقت واحد میں دو شاعروں کے جنازے رکھے

[illegible]

سمنٹ کے تھیلے اور ایک ہزار اینٹیں سلیقے سے سجا دی تھیں، بجری پتھر بھی لگا دیا
پانی کے لیے مٹی کے کوزے اور گھڑے ایک طرف رکھے تھے۔ بشیر بھائی کے
سلیقے کی کیا تعریف کی جائے۔ مختصر یہ کہ شاعروں کی تجہیز و تکفین کا مکمل
انتظام کرنے کے بعد بھی وہ مطمئن نہیں ہوئے۔ کہنے لگے کہ ایک ایک گز کے
فاصلے سے قبریں بھی تیار کر دی جائیں، اور بہ تحریر کتبے بھی قبروں کے
سرہانے عارضی طور پر لگا دیئے جائیں تو مناسب ہے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔
پہلی فرصت میں ایک درجن قبریں تیار کر دی گئیں، اور بشیر بھائی ہر محلے کے
شاعر کو نہایت سلیقے سے دفن کرنے لگے۔ ان کو مسرت اس بات کی تھی کہ
وہ شاعروں کو مرنے کے بعد تو ایک دوسرے کے قریب کر سکے۔

ایک روز بشیر بھائی آئے۔ چہرے پر اضطراب تھا، کہنے لگے گزشتہ
شب فلاں شاعر کا انتقال ہو گیا۔ میں نے صبح کو ان کے لیے قبر نمبر چھ الاٹ
کی تھی۔ بس قیامت آ گئی۔ مرحوم کے بیوی بچے آئے۔ بے تحاشہ سر پیٹنے اور
رونے لگے۔ میں نے وجہ دریافت کی، کہنے لگے
"مرحوم نے وصیت کی تھی کہ ان کو ہر گز ہر گز قبر نمبر چھ میں دفن نہ کیا
جائے۔ مرحوم جدید شاعر تھے اور قبر نمبر پانچ میں ترقی پسند شاعر مدفون ہیں
مرحوم کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔ خدا کے لیے ایک قبر چھوڑ کر قبر نمبر سات
مرحوم کے لیے الاٹ کی جائے اور قبر نمبر چھ اور قبر نمبر آٹھ یعنی مرحوم کے
دونوں پہلوؤں میں کسی شاعرہ کو دفن کیا جائے، خواہ وہ کسی بھی مکتب خیال کی

حامل ہوں۔ مرحوم کو کوئی اعتراض نہیں"۔

اب بشیر بھائی کے لئے کئی مسئلے پیدا ہو گئے تھے۔ بشیر بھائی امن پسند اور صلح جو انسان تھے۔ مرحوم شاعر کی وصیت پر عمل تو کر دیا، لیکن مستقبل کے اندیشوں سے ہراساں تھے۔ ایک ریٹائرڈ آفیسر کی مدد لینی پڑی، جس نے مستقبل کے لئے ایک پروگرام بنانے میں بشیر بھائی کی مدد کی اور ایک پروجکٹ تیار ہو گیا۔

ہوا یوں کہ تنظیم نو کے تحت صف بندی کی گئی۔ کلاسیکی شاعروں کی قبروں کے لئے کچھ صفیں، کچھ صفیں، کچھ ترقی پسندوں کے لئے اور کچھ جدیدیوں کے لئے۔ مذہبی شاعروں کو شاعرات کی قبروں سے بہت دور کھجوروں کے درختوں کے نیچے دفن کرنے کا انتظام کیا گیا تاکہ آئندہ تدفین کے موقع پر کوئی خلل نہ ہو سکے۔ اس اسکیم کی تکمیل کے بعد بشیر بھائی نے مجھ سے کہا۔۔۔۔ (خفت نمایاں تھی) کہ صفیں علیحدہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ میرا مقصد تو پورا ہوگا ہی، سب کے سب ایک ہی احاطے میں دفن تو ہوں گے، ایک دوسرے کے قریب تو ہوں گے۔ میں نے بھی ہاں میں ہاں ملا دی۔

خدا خدا کر کے ابھی اس مسئلے سے نمٹے ہی تھے کہ ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ ہوا یہ کہ ایک ہر دلعزیز شاعر جن کا ترنم بھی درجۂ اول کا تھا۔ انتقال کر گئے لیکن شاعروں کا ہجوم بشیر بھائی کے گھر پر قیامت کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اور سب کا مطالبہ تھا کہ مرحوم کو شاعروں کے قبرستان میں دفن نہ کیا جائے۔ وجہ اس کی یہ تھی مرحوم کو، کوئی شاعر یا کوئی نقاد، "شاعر" تسلیم کرنے

کے لئے تیار نہیں تھا۔ سب یہی کہتے تھے کہ مرحوم متشاعر تھے یعنی شاعر واعر تو تھے نہیں البتہ ترنم اچھا تھا۔ یا تو وہ خود قوال تھے یا کسی قوال کی نسل سے تھے۔ لوگ باگ ان کو غزلیں کہہ کر دے دیا کرتے تھے۔ ایک سو مستند سامعین، پچاس منتظمین، پچاس شاعرات اور دو سو شعرائے کرام حلف لے چکے ہیں یعنی جملہ چار سو بیس افراد افی ڈیوٹ (Affidavit) پر دستخط کر چکے تھے کہ مرحوم متشاعر تھے۔ ان کو اس مقدس قبرستان میں دفن کرنا ملک کے عظیم دانشور طبقے، عظیم شعرا باذوق سامعین اور حاتم دل منتظمین کی توہین کے مترادف تھا۔۔ بشیر بھائی بے بسی سے بولے:

"خیر کوئی بات نہیں۔ شاعروں کے قبرستان کے پچھواڑے تھوڑی سی جگہ خالی ہے، وہیں مرحوم کو دفنایا جائے گا"۔ اس تجویز پر تو سب لوگ آپے سے باہر ہوگئے۔ کہنے لگے۔

"کبھی اس جانب کی دیوار سو دو سو سال کے بعد گر جائے تو لوگ ان کی قبروں کو بھی شاعروں کی قبروں میں شامل کر کے احاطے کی دیوار کو وسیع کر لیں گے اور پھر ان متشاعروں کو بھی شاعروں میں گنا جانے لگے گا۔ لہٰذا قبرستان کے پچھواڑے بھی مرحوم کو دفن کرنے کے لئے مجمع راضی نہ ہوا۔ البتہ یہ طے ہوگیا کہ قبرستان کے پچھواڑے کھلی جگہ اصلی مزاحیہ شاعروں کے لئے وقف کی جاسکتی ہے۔ بشیر بھائی مایوس ہوئے اور بیچارے مرحوم کو لے جاکر ایک لاوارث قبرستان میں دفن کر دیا۔۔۔ تدفین کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ مرحوم کی دائیں جانب ایک شاندار قبر

جو وہاں تھی۔ کتبے پر سانو خادم ہز ماسٹرز وائس متوفاۃ بنا لیسہ الہ المہفی کے ایک وفادار ملازم کی قبر تھی۔ فرماں برداری کے صلے میں فرم نے اس کی شاندار قبر تیار کی تھی۔

"تدفین کے بعد بشیر بھائی بہت غمگین نظر آرہے تھے لیکن سارے شاعر نقّاد اور باذوق سامعین مسرور تھے کہ مرحوم کو ہز ماسٹرز وائس کمپنی کے قریب جگہ ملی ہے اور بعض شعرا یہ شعر گنگنا رہے تھے۔

کند ہم جنس باہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر، باز با باز

ایک سیماب صفت دانشور

میں نے اپنی ساری زندگی میں صرف ایک شاعر پر دو نظمیں کہیں ، اور
ایک قطعہ کہا ۔ وہ تھا مخدوم ۔ اسی بہانے مخدوم پر میری نظم پڑھ لیجئے ۔
مخدوم کے جنازے کے ساتھ چلتے چلتے یہ نظم ہو گئی تھی

ایک ہیرے کے ہزاروں پہلو
منعکس نور کہیں ، رنگ کہیں

سخت جاں ایسا

کہ لاکھوں نظریں

اس سے ٹکرا کے پلٹ جاتی تھیں
نور کی دھار سے کٹ جاتی تھیں

کہتے ہیں آج اسی ہیرے کو

اپنے سینے سے لگائے ہوئے مٹی کی نہریں
ڈوبتی جاتی ہیں تاریکی میں
لیکن اے ہم وطنو!
میرے مخدوم کی روح
شہرِ خاموش میں خوابیدہ ہے
درد کے ہر در و دیوار سے وابستہ ہے۔

مخدوم بھائی اور لودھی بھائی (نواب غلام محمد خاں لودھی، سابق ڈپٹی میئر عظیم تر حیدرآباد و اسپیشل میٹروپولیٹن مجسٹریٹ) کی شخصیتیں پہلو دار ہیں، اور ہر پہلو زندگی کو آئینہ دکھاتا ہے۔ مخدوم بھائی کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ تھے، اور لودھی بھائی کانگریس سے۔ وہ سخن ور تھے اور یہ سخن فہم۔ مخدوم جن مسائل کو لے کر اٹھے تھے وہ ان کے اپنے مسائل بھی تھے، لیکن لودھی بھائی جاگیردار ہونے کے باوجود مزدوروں کے مسائل سے وابستہ ہیں۔ مخدوم کی روح آفاقی اور درد کے ہر در و دیوار سے وابستہ ہے اور لودھی بھائی جب کبھی غریب نادار بچوں کو ہوٹلوں، گرنیوں اور دوکانوں میں ملازم دیکھتے ہیں تو انھیں اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے، کہ ہائے لکھنے پڑھنے کی عمر پیٹ کی مزدوری میں گزر رہی ہے، ان کی راتیں فٹ پاتھ پر بسر ہو رہی ہیں۔

قوم کی عزت فٹ پاتھوں پر سوتی ہے
ننھے دیپک مکتب کی راہوں میں بجھے پڑے ہیں

مخدوم کے آہنی عزم نے ان کو ایک مسلک اور ایک ہی سیاسی پارٹی سے وابستہ رہا لیکن لودھی بھائی کی سیاست میں لے [illegible] [illegible] تلاش کرنے کی کوشش کی، اس میں ذاتی منفعت شامل نہیں تھی بلا عوام سے مسائل کا حل ڈھونڈنے کی کوشش تھی جس میں شدت بھی تھی اور جاگیردارانہ غصہ بھی شامل تھا۔ لودھی بھائی اور مخدوم بھائی میں ایک اور صفت مشترک ہے وہ یہ کہ دونوں سدا بہار کے نمونے ہیں۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ نے مخدوم کے تعلق سے کہا تھا لیکن میں لودھی بھائی کے تعلق سے کہتا ہوں کہ لودھی بھائی جب بھی کسی نوجوان حسین لڑکی کو قریب سے گزرتی ہوئی دیکھ لیتے ہیں تو اپنے کھادی کے بش شرٹ کا کالر درست کر لیتے ہیں۔ لڑکی تھوڑی دیر کے لئے ٹھٹک کر رہ جاتی ہے اور اس لڑکی کی ماں آگے بڑھ کر کہتی ہے۔

"بیٹی سلام کرو، یہ لودھی چاچا ہیں، میرے نانا کے ہم جماعت رہ چکے ہیں" لودھی بھائی کے تعلق سے یہ بات مشہور ہے کہ وہ پہلے کر دیتے ہیں اور بعد میں سوچتے ہیں کہ انھیں کیا کرنا چاہیئے تھا۔ یعنی فکر و نظر کے اعتبار سے بھی پٹھان کی یہی نشانیاں ہوتی ہیں۔ کسی زمانے میں ابراہیم لودھی نے مغلوں سے شکست کھائی ہوگی۔ لودھی بھائی، ابراہیم لودھی کی اولاد ہونے کے باوجود کسی مسئلے پر بھی شکست تسلیم کرنے آمادہ نہیں۔ وہ کبھی ہار نہیں مانیں گے، وہ جانب دار ہیں۔ وہ پسند، ناپسند کے اسیر ہیں۔ خود تنقیدی کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس طرح کے آپ ہزار الزام ان پر

لگا لیں مگر حقیقت [illegible]
کچھ سوچا ہے، اور یہ بات ان کے مستقل کردار سے واضح ہوتی ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ وہ صمصام الملک کی دیوڑھی سے علی الصبح سائیکل پر نکلے ہیں۔ رکن بلدیہ کی حیثیت سے سارے محلے کی کیفیت لے رہے ہیں۔ بلدیہ کے خلاف شکایتیں ڈائری میں نوٹ کرتے جا رہے ہیں اور بلدیہ کی اجازت کے بغیر تعمیر کی ہوئی ان کھڑکیوں کو جن پر پھول دار پردے پڑے ہوئے ہیں۔ لودی بھائی گھورتے بھی جا رہے ہیں۔ گھر لوٹے ہیں، ناشتہ کیا ہے اور بچوں کو کار میں ساتھ لے کر اسکول پہنچے ہیں۔ بچوں کو وہاں چھوڑنے کے بعد اگر ضرورت محسوس کی تو کچھ دیر بچوں کی ٹیوٹر سے ضروری بات بھی کر لی۔ پھر بلدیہ کے دفتر آ گئے ہیں۔ وہاں کے کاموں سے فارغ ہو کر گھر پہنچ گئے ہیں۔ ان کا یہ عمل رکن بلدیہ سے لے کر تنظیم تر حیدر آباد کے ڈپٹی میئر ہونے تک برابر جاری رہا۔ اس دوران بچوں کی ٹیوٹر سے ملنے کا اہم کام کبھی نظر انداز نہیں کیا۔

میں نے انھیں سر مغرب پینٹ بش شرٹ میں سمنٹ روڈ پر ٹہلتے بھی دیکھا ہے۔ رکشا میں، بس میں بھی دیکھا ہے۔ ایک ہی دن میں سائیکل موٹر کار، رکشا، پیدل اور بس میں سفر کرتے بھی دیکھا ہے۔ نہ موٹر نشینی کے نشے پیشانی پر غرور و تکبر کے نشان تھے۔ نہ سائیکل بس اور رکشا میں بیٹھتے وقت احساس کمتری کا شکار تھے۔ یہ معمولی باتیں نہیں ہیں۔ جو لوگ زندگی کے حقائق کے عارف ہوتے ہیں، وہ ان سطحی اور معمولی احساسات سے بہت بلند ہوتے ہیں۔

ان کے سیاسی راستے بدلنے سے میں ہمیشہ اختلاف کرتا رہا۔ لیکن
اس بات کا میں قائل رہا کہ وہ ہمیشہ حق پر رہے۔ انھوں نے جھوٹ سے کبھی
مصالحت نہیں کی۔ لچک دار رویہ آج کی سیاست میں بے حد ضروری ہے
اور یہ بات اصلی پٹھانوں کے بس کی نہیں۔ ان سے جونیئر لوگ آج پارٹی کے
بڑے بڑے کلیدی عہدوں پر فائز ہیں۔ لیکن لودھی صاحب اب بھی حق کی اور انصاف
کی کرسی پر براجمان ہیں اور مطمئن ہیں۔ لودھی بنگالی، فارسی، ہندی، اردو اور بنگلہ سے
واقف ضرور ہیں لیکن انگریزی ادب اور اردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتے
ہیں۔ اردو ادب سے ان کی وابستگی کے سلسلے میں تیس سال پہلے کا ایک واقعہ
آپ بھی سن لیجئے۔

لکھنؤ کا شہر ہے۔ [illegible] حویلی کی چھت پر سفید چاندنی کا فرش
ہے۔ گرمی کا موسم ہے۔ چودھویں رات کا چاند حاضرین پر چاندی کے ورق برسا
رہا ہے۔ دیواروں سے گاؤ تکیے لگے ہیں۔ گلاب اور کیوڑے میں بھیگی ہوئی مدر
کی لال لال صافیوں میں ننھی ننھی گلوریاں کشتیوں میں سجی ہوئی ہیں۔ گلدستوں کے
دستوں کے پاس مشک و عنبر و زعفران کی خوشبوئیں حاضرین کو مست کر رہی
ہیں۔ پنکھوں پر موتیا کی لڑیاں عجیب بہار دکھا رہی ہیں۔ مشاعرہ اختتام کے
قریب آپہنچا ہے۔ شمع اشرف الحکما حضرت حکیم آشفتہ لکھنوی کے سامنے آئی۔
موصوف لکھنؤ کی زبان کے شاعر ہی نہیں بلکہ استاد بھی تھے۔ وہ غزل پڑھ چکے کہ
سامعین لوٹ پوٹ ہو گئے۔ لیکن بر خلاف لکھنؤ کے اعتراض و تنقید کرنا پیدائشی
حق بڑے بڑوں پر اعتراضات کئے ہیں۔ میر تقی میر کو بھی جواب دینا پڑا تھا

سہاچپ سے آشفتہ کس گنتی میں تھے ایک صاحب بانکی ترچھی ٹوپی پہنے۔ نیچی چولی کے انگرکھے میں ملبوس مونچھوں پر تاؤ دے کر بولے۔

"حضرت آشفتہ! یہ محاورہ صُم ہو جانا، اہلِ لکھنؤ نہیں بولتے اور یہ بے معنی بھی معلوم ہوتا ہے"، بے چارے آشفتہ مرحوم نے کچھ بھی جواب نہ دیا، پی گئے ـ ... سرخ و سفید رنگ کا بڑے بڑے دیدوں والا نوجوان اُٹھا۔ سفید اچکن اور اریب کے پاجامے میں ملبوس، لہجہ باوقار اور اعتماد سے کھرا ہوا تھا آگے بڑھا اور کہنے لگا۔

"حضور گستاخی معاف! آپ جیسے بزرگ حضرات کے روبرو [illegible] زبان کھولنے کی جسارت کیسے کر سکتا ہے، لیکن خاموش رہنے سے سخن فہمی کے ذوق پر آنچ آتی ہے اس وقت حضرت آشفتہ پر اعتراض ہوا ہے اس لئے جواب میں کچھ عرض کرنا احقر کے لئے واجب ہے۔ یہاں "صُم ہو جانا" کے معنی [illegible] وجاہت ہو جانا [illegible] آشفتہ اُٹھے اور اس نوجوان کو گلے لگا لیا۔ پوچھا "صاحبزادے تم کو کس نے یہ معنی سمجھائے تھے"۔ نوجوان نے کہا "میں نے حیدرآباد میں اپنی ماں کو، نانی کو، دادی کو یہ محاورہ بولتے سنا ہے۔

"دُو لوا جیسے ہی بے نظیر کی چوری پکڑی گئی، اس کے کمرے سے کپڑے اور زیور کی گٹھڑی برآمد ہوئی تو بس، ہمارے روبرو گردن جھکا کر کھڑی ہو گئی تھی، بس سمجھو صُم ہو گئی تھی، منہ سے کچھ نہ نکلتا تھا۔" اب حکیم آشفتہ شیر ہو لئے، کہنے لگے ـــــ مزید کچھ اعتراضات ہوں تو اس لڑکا

سے پوچھ لیجئے، یہ سرخ و سفید نوجوان جس کے رخساروں پہ سبزہ آغاز ہو رہا
تھا، نواب غلام محمد خاں لودھی تھے ۔

لودھی بھائی قریباً ہر اہم مشاعرے میں آتے ہیں اور داد و بیداد میں
ہمیشہ انصاف کو پیش نظر رکھتے ہیں [illegible] شاعروں سے زیادہ شاعرات کا کلام پسند
کرتے ہیں [illegible] وجہ دراصل ان کا موسیقی سے لگاؤ ہے ۔ ان کا خیال ہے
کہ شاعرات [illegible] اشعار کی تاثیر کو ترنم کا کندھا لگا کر خوب داد حاصل کرتی
ہیں ۔

لودھی بھائی کو میں نے سازوں اور آوازوں سے بھی کھیلتے دیکھا ہے،
راگ پہچان کر اس کی نزاکتوں کی داد دینا کوئی ان سے سیکھے ۔ گانے
والی خاتون اگر ملیح بھی ہو تو لودھی بھائی کی داد آفاق کو چھونے لگتی ہے ۔ موسیقی
سے لگاؤ بھی ان کے کردار کا ایک جمالیاتی پہلو ہے ۔ لودھی بھائی نہ صرف اچھے
نثر نگار کی طرح اچھی اردو بولتے ہیں، بلکہ انگریزی بھی روانی کے ساتھ بولتے ہیں
تلفظ سے انگریز نہیں بلکہ صاف ہندوستانی معلوم ہوتے ہیں ۔ انگریزی میں ادبی
زبان سے لے کر قانونی زبان تک سے واقف ہیں ۔ اردو سے انگریزی تک یہ
سفر انہوں نے درمیانی عمر میں طے کیا ہے اور بہت جلد طے کیا ہے ۔ اس سفر
میں بچوں کی استانیوں نے کہیں سایہ دار درخت بن کر کہیں ٹھنڈی جھیل بن کر
لودھی بھائی کی مدد کی ہے اور سفر کو آسان و خوش گوار بنایا ہے ۔ لودھی بھائی
کے ہاں سینکڑوں سانس لیتے ترجمہ انگریزی ناول ہیں ۔ ڈاکٹر عبد اللطیف مرحوم
نے ایک مرتبہ لودھی بھائی سے انگریزی میں مسودہ لکھوایا تھا ۔ اور بہ نظر اصلاح

دیکھ کر فرمایا تھا :

"اگر مجھے جامعہ ڈگریاں عطا کرنے کا حق دیتی تو تم کو انگریزی ادب میں ایم، اے کی ڈگری دے کر فخر محسوس کرتا۔" یہ ساری صلاحیتیں لودھی بھائی کو کسی بڑے عہدے تک پہنچانے میں ناکام رہیں۔ حق گوئی اور قلندری میں ساری عمر گذار دی۔

[illegible] خدمت خلق میں [illegible] جو دکھایا، کبھی نہیں لکھایا۔ اس کی سفارش کی، دوسروں کا کام نکالا۔ اس سے حق کی خاطر جھگڑا کیا، اس سے مروت کے مارے بات کرلی۔ خدمت خلق کا یہ آفتاب علی الصبح گھر سے طلوع ہوتا ہے۔ اور رات کو اپنے [illegible] غروب ہو جاتا [illegible] نہ سونا، نہ چاندی، [illegible] ڈپازٹ۔ [illegible] دوسروں کی مدد کرنا ان کا مذہب ہے۔ خود بھوکے رہتے ہیں اور دوسروں کو [illegible] کی اجازت دے دیتے ہیں۔ یہ محبت بانٹنے والے ہاتھ [illegible] سے بے نیاز ہیں۔ یہ ہاتھ افق تا افق پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ ہاتھ صرف اپنوں کی حد تک محدود نہیں بلکہ [illegible] کے مطابق :

ان ہاتھوں کی تعظیم کرو، ان ہاتھوں کی تکریم کرو
دنیا کے چلانے والے ہیں، ان ہاتھوں کو تسلیم کرو

میں اپنے مطلب میں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ لنچ کے بعد قیلولہ میرے لئے ضروری ہے، لیکن ایک نظم جنم لینے کو تیار تھی۔ ہاتھ میں قلم اور میز پر فل اسکیپ سائز کا پیڈ رکھا ہے۔ مطلب کے دروازے پر کھٹکا ہوا۔ احمد ندیم قاسمی کا یہ شعر پڑھتا ہوا باہر نکلا:

انداز ہو بہو تری آوازِ پا کا تھا
دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا

مگر یہاں تو ایک پردہ دار آٹو رکشا سے خوشبو کے جھکڑ چل رہے تھے۔ پوچھا۔ "کون ہے"۔ کہا۔ "مریضہ"۔ "اندر آئیے" کہہ کر میں مطلب میں واپس آگیا، بش شرٹ کا کالر درست کیا۔ قلم اور پیڈ کو میز کی ایک جانب سرکا دیا اور اسٹیتھسکوپ سنبھال کر بیٹھ گیا۔

ایک جوان تھا، ایک لمحہ گو جا۔ "تسلیم" بس پہچانا [illegible] [illegible]

اب جو سر سے پاؤں تک محترمہ کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ محترمہ قطعاً مریضہ نہیں ہیں بلکہ میں خود "نروس بریک ڈاؤن" کے مرض میں مبتلا ہو چکا ہوں ..... سینکڑوں مریضاؤں کو دیکھا، حسین سے حسین، بدصورت سے بدصورت، پڑھی لکھی فیشن ایبل سے لے کر جاہل اور گنوار تک نظروں سے گذر چکی ہیں، لیکن یہاں صورت ہی کچھ اور تھی بقولِ فراق ؏

سر سے پا تک چہرہ ہی چہرہ

ایسا پرفیوم، ایسا لباس، ایسا میک اپ، جھجک، جرأت، سب کچھ مل کر ایک مصرعہ بن گیا تھا۔ ؏

ساغرِ کیف ہو، پھولوں کا سمندر تم ہو

نام پوچھا، عمر دریافت کی۔ "تکلیف کیا ہے"۔ جواب ملا۔ "دل میں درد ہوتا ہے"۔ اختلاج تھا۔ بلڈ پریشر دیکھا۔ عمر کے لحاظ سے زیادہ تھا۔ اب میرا اسٹیتھسکوپ دل کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے تجویز پیش کی .... "E.C.G ضروری ہے، میں ایک پرچی پر لکھے دیتا ہوں۔ فی الحال یہ دوائی استعمال کیجئے"۔ ایک چھوٹے سے پیکٹ میں تین گولیاں دے دیں۔ صبح دوپہر، شام آدھی گولی بعد غذا۔ نمک کم استعمال کریں۔

محترمہ نے فیس پوچھی۔ میں نے کہا کہ کوئی بات نہیں۔ پھر دیکھا جائے گا وہ اڑ گئیں۔ ادھر میں بھی ضد پر آگیا کہ نہیں لوں گا، تو محترمہ نے پندرہ روپے میز پر یہ کہہ کر رکھ دیئے۔

"اچھا تو آپ کا مجموعۂ کلام "آواز کا رنگ" کا ایک نسخہ ہی عنایت فرمائیے"
میں مجموعۂ کلام کو بالمعاوضہ دینا نہ صرف ضروری بلکہ اپنی جائز آمدنی میں شمار
کرتا ہوں۔ چنانچہ ایک جلد محترمہ کے حوالے کی۔ محترمہ نے کہا: "اس پر
میرا نام لکھ دیجئے۔" میں نے لکھ دیا اور کہا "جب آپ تحفے کے طور پر
قبول کر رہی ہیں تو معاوضے کا سوال ہی نہیں ہے۔ آپ کے روپے واپس
لے لیجئے۔" محترمہ نے کہا۔ "پھر کبھی لے لوں گی۔" اور وہ مطب سے باہر
نکل گئیں۔ بڑی دیر تک سرور کا عالم رہا۔

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

تیسرے دن وہ [illegible] لے کر آئیں۔ میں نے نسخہ لکھ دیا۔
وہ بولیں "اس اتوار کو پانچ بجے شام غریب خانے تشریف لائیے — کچھ
دوست [illegible] آپ کے کلام سننے کی مشتاق ہیں اور رات کا کھانا ہمارے
[illegible] ہے۔ یہ رہا میرے گھر کا پتہ۔" بغیر کچھ جواب لئے وہ چل دیں
میں حیران لیکن دل میں خوشی کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ اتوار کو تین دن
باقی تھے۔ یہ تین دن تین صدیوں میں بدل گئے۔ ایک جمعرات میں کتنی جمعراتیں
نکل آئیں۔ ایک جمعے میں کتنے جمعے، اور ایک ہفتے میں کتنے ہفتے نکل
آئے۔ تین صدیوں کے دشت و صحرا سے گذر کر اتوار کی منزل آئی۔ ایک
شاعر کو دنیا کی سب سے بڑی دولت اس کے سامعین اور مداح ہوتے ہیں
ویسے یہ مرض بھی بین الاقوامی مرض ہے۔ جب ساری دنیا خوشامد پسند ہو
تو [illegible]

کا اتنا طالب نہیں ہوتا جس قدر داد کا طالب ہوتا ہے۔ اس کے منہ پر اس کا برا بھلا کہیے۔ یہاں تک دو ادبی گالیاں بھی دے دیجئے وہ سُن لے گا برداشت کر لے گا۔ شرط صرف اس قدر ہے کہ پہلے اس کی ساری شاعری کی نہیں تو کم از کم کچھ اشعار ہی کی تعریف کر دیجئے۔ بس سمجھ لیجئے کہ آپ نے شاعر کے اقلیم دل کو فتح کر لیا ہے۔

تین منڈیوں کے بعد اتوار آئی تو میں نے اپنا قیمتی سوٹ نکالا، پریس کیا۔ تازہ سینٹ کی بوتل الگ رکھی۔ شیو کیا۔ غسل کیا اور "رونمائی" کے لئے روانہ ہو گیا۔ حقیقت میں وہاں اپر مڈل کلاس کے فیشن ایبل حضرات و خواتین کی بھیڑ لگی تھی۔ ارے، ایسے فیشن ایبل محلے میں اردو شاعری کی یہ قدر ہے دل کو، آنکھوں کو یقین نہیں آرہا تھا۔ خدا خدا کر کے جانبین کا تعارف ہوا۔ اس کے بعد میں نے میٹھے شربت کا ایک گھونٹ لے کر غزل کا مطلع پڑھا۔

ہر بن مو پہ رُکے چاند وہ پیکر تم ہو
ساغر لیف ہو، پھولوں کا سمندر تم ہو

تعریف سے چھت پھٹی جا رہی تھی۔ اسی طرح ساری غزل کا استقبال ہوا۔ خوشی کے مارے میں پھولا نہیں سما رہا تھا کہ کیسے باذوق سامعین ملے ہیں۔ ابھی داد کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک محترمہ نے چیخ کر کہا۔

"لیجئے، مے نوش شاہد نگری بھی آ گئے اب اور لطف آئے گا۔"

میں خوب جانتا تھا کہ موصوف خاص شاعر تو نہیں ہیں ترنم بلا کا ہے مگر لیتے ہیں تو گردن کی ساری رگیں تن جاتی ہیں اور سارا بدن تھر تھرانے

[illegible] اچھا ادمی ہیں [illegible]

محمد حسین آزاد مرحوم ان کی شاعری ان کا آذوقہ ہے۔ ان کے منہ میں چونگا ان کا
اپنا نہیں کسی اور کا دیا ہوا ہے۔ کئی مضامین شائع [illegible] اس سلسلہ شریفانہ
کو بحسن و خوبی انجام دیتے ہیں۔ بہرحال مے نوش صاحب شروع ہوئے تو
داد کا وہی عالم تھا جس پر کچھ دیر پہلے مجھے ناز تھا۔ بات اب سمجھ میں آگئی۔
کلام نوازی کے اختتام پر ڈائننگ روم پہنچے۔ اچھے اچھے ہاتھ اچھی اچھی
ڈشیں تقسیم کرتے رہے۔ کچھ لوگ اس بفے سے فائدہ اٹھا کر اپنی اپنی رکابیاں
بھر لیں اور دور چمن میں میزوں کے اطراف کرسیوں پر جم گئے۔ میں نے بھی
ایک حلقہ پیدا کر لیا تھا۔ میں ذرا احتیاط پسند اور انصاف پسند ہوں،
دو خواتین، ان کے دو شوہر اور اپنی خاص میزبان کے ساتھ ایک گول میز کے
گرد ہم لوگ بیٹھ گئے تھے۔ میں نے ہلکے سے طنز کے ساتھ ایک جملہ کہا۔ وہ
سب طنز کو سمجھ نہ پائے اور مجھے جواب مل گیا۔ میں نے کہا تھا۔

"کم از کم آپ حضرات میں اردو کے تعلق سے ایسا جذبہ قابلِ قدر ہے
پکچر نہیں دیکھی، کلب نہیں گئے۔ ایک مشاعرہ ہی کرا لیا"

یک لخت سبھوں نے میری ہاں میں ہاں ملا دی۔ "بالکل بالکل آپ
صحیح فرماتے ہیں۔ اس میں بگڑتا بھی کیا ہے ہمارا۔ گھر میں نہ کھایا، یہاں کھا لیا اور
سننے کو شاعری مل گئی۔ پکچر جانا، کلب جانا تو روز کا کام ہے ہی۔ آج کچھ
پروگرام بدل دیا بس مزا آ گیا۔" مزا تو ان کو آیا لیکن میں خفیف ہو گیا اور میرے
دل میں ان کے ادبی ذوق پر آنچ بھی آ گئی۔

گیارہ بجے رات کو محفل برخاست ہوئی اور [illegible] محترمہ نے مجھے اپنی
کار میں بٹھا لیا۔ راستے میں زیادہ بات چیت نہ ہوئی۔ البتہ جب میں اپنے گھر
پر اترا تو محترمہ نے مجھے "پارکر کا سیٹ" بطور تحفہ دیا اور نہایت انکساری
سے درخواست کی کہ میں ان کو اپنی شاگردی میں قبول کر لوں۔ کر لیا کیا کرتا۔
اس کے ساتھ ہی بیاض بھی پیش کی گئی۔ "اس میں کچھ بکواس ہے آپ کی
کی توجہ کی محتاج ہے"۔ میں نے بیاض بھی لے لی۔ "ضرور ضرور"۔

محترمہ نے دریافت کیا۔ "پھر کب حاضر ہوں؟"
"میں نے جواب دیا۔ "جب دل میں ہورد اٹھے تب آنا"۔ وہ ہنسی کے
فوارے اڑاتی کار میں گھس گئی۔

دوسرے یا تیسرے دن جب میں نے بیاض کھولی تو پہلی ہی غزل
کا ڈھانچہ ایسا تھا کہ جی خوش ہو گیا۔ ڈیڑھ مصرعے کا مطلع، دوسرے شعر
کا مصرعۂ اولیٰ تھا ثانی غائب۔ تیسرے شعر میں صرف قافیہ تھا۔ چوتھے شعر
میں مصرعۂ ثانی تھا۔ پانچویں شعر میں دونوں مصرعے تھے لیکن قافیہ نہیں تھا،
اور مقطع میں صرف تخلص تھا۔ آگے پیچھے ڈاٹ ڈاٹ لگے تھے۔ سر پکڑ کر
بیٹھ گیا۔

ایک حسین خاتون کی غزل بنانی تھی۔ پورے انہماک کے ساتھ عملِ جراحی
شروع ہوا۔ اپنے سارے فن کو نچوڑ دیا۔ ساری عمر کی کمائی داؤ پر لگا دی۔ غزل
گلدستہ بن گئی۔ فوراً اپنے پیڈ پر غزل لکھ کر محترمہ کے گھر ڈاک کے ذریعے بھیج
دی۔ کاغذ کے ایک گوشے پر پرو فیسی سینٹ کا ایک ابہام انگشت بھی ثبت

[illegible] غزل

دو دن بعد بنا ہیں کے لیکن کسی طرح ایک ہفتہ ٹل گیا۔

اُدھر سے ایک شکریے کا خط ایک چیک رجسٹرڈ پوسٹ کے ذریعے ملے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ "محنت کا معاوضہ" ایک حسین خاتون سے ملا تھا جی خوش ہو گیا۔ اس وقت میں ساتویں آسمان پر تھا۔

اِدھر شیر کے منھ کو خون لگ گیا۔ یکے بعد دیگرے ساری غزلیں ختم ہوئیں۔ نو دس ماہ میں دیوان تیار تھا۔ میں نے احتیاط یہ برتی تھی کہ ہر آٹھویں دن صرف ایک غزل کی اصلاح کر کے بھیجتا ورنہ عجلت کرتا تو ہو سکتا تھا کہ دو غزلوں کا معاوضہ ایک ہی چیک پر ٹل جاتا۔

مجموعۂ کلام شائع ہوا۔ وہ دھوم کا جلسہ منعقد ہوا۔ چار تو منسٹر تھے دس آئی، اے، ایس آفیسرز۔ سینکڑوں شاعر و شاعرات، کئی نقادانِ فن جن کے معدے میں اسکاچ وہسکی کے چار چار پگ تھے۔ سامعین سے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا۔ ساری بارات کی دولھن ہماری عزیز شاگرد شاعرہ، پھولوں سے لدی شاخِ گل لجاتی جا رہی ہے۔ ہر دس منٹ سے اس کی استدعا کہ ہم اس کے برابر میں بیٹھیں لیکن ہم اس کے روبرو بیٹھنے پر مُصر۔ سامنے بیٹھنے میں افادیت یہ ہے کہ غزل کے منھ سے غزل سُن سکتے ہیں۔ آواز تو تھی ہی اچھی۔ نقادوں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ یہ سب نقاد میرے جانی دوست تھے، کھانے پینے، آمد و رفت کے اخراجات کے علاوہ ایک ایک سو روپے لے کر آئے تھے۔ کسی نے کہا:

"محترمہ ہمارے [illegible] مشاعروں کی [illegible] آواز ہیں۔" [illegible] نے کہا:
"[illegible] کلاسیکی روایت [illegible] جدیدیت کی علم بردار ہیں [illegible]
کی وراثت دار ہیں۔" کسی نے کہا "ہندوپاک کی ساری شاعرات میں سب سے
زیادہ سماجی شعور صرف محترمہ ہی کے ہاں ملتا ہے۔" اس جملے پر ایک جدیدیت
کے حامی نقّاد بگڑ گئے۔ غرض جتنے منھ اتنی باتیں۔

محترمہ نے ایک سو پھولوں کے ہار بنوائے تھے۔ یہ کام میرے ایک
دوست بہبود داور نے انجام دیا تھا۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے
مختلف انجمنوں اور شخصیتوں کی جانب سے صرف پچھتر ہار پہنا دیئے۔ مابقی
رقم جیب میں رکھ لی۔ جلسہ برخواست ہوا تو محترمہ نے میرے کان میں چپکے
سے کہا:

"ڈاکٹر صاحب آپ کے دوست نے پچیس ہاروں کے پیسے بچا لیے
میں ابتدا ہی سے ہاروں کو برابر گن رہی ہوں۔" میں نے کہا:
"آج، خوشی کے موقع پر خاموش ہو جائیے۔ اس کا شکریہ ادا
کیجئے۔ پچیس ہاروں کی رقم اور ایک مسکراہٹ انعام میں دے دیجئے۔"
اب محترمہ کے قلم کے منھ کو خون لگ گیا تھا۔ دوسرا مجموعہ شائع
کرنے کا ارادہ ہوا۔ ایک سے ان کی کیا تسکین ہو سکتی تھی۔ میں نے کہا:
"وقفہ دیجئے۔ اس قدر جلد بازی ٹھیک نہیں ہے۔ پہلے آپ ان سو غزلوں
کو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنے کی مشق جاری رکھیے۔ جب کامل عبور ہو جائے
تو میں ایک دوسرا مجموعہ کلام نذرِ [illegible] پیش کر سکتا ہوں۔" میں بھی

تھک چکا ہوں۔ آپ بھی تھک گئی ہیں۔ ہم پہاڑی کی چوٹی سر کر چکے ہیں
اب سلامتی کے ساتھ دوسری جانب اترنا ہے۔ چڑھنے سے زیادہ اترنا
مشکل کام ہے۔ ہر لمحہ پاؤں پھسلنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ قدم سنبھال کر رکھنا
ہوگا۔ احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کیونکہ احتیاط کو بالائے طاق رکھنے کی
عمر تو گئی۔"

فی الحال وہ مان گئی ہیں۔ اب بغیر غزل کے بھی چیک وصول ہوتے
ہیں۔ کبھی کبھی مجھے خود جاکر چیک حاصل کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس کارِ لطیفہ کو
میں نے عام نہیں کیا ہے۔ ایک ہی پرستار کے حصول پر قانع ہوں۔ محترمہ پر
کئی حضرات نے جال پھینکے لیکن وہ کبھی تمکنت سے، کبھی محبت سے معذرت
کر کے بچ جاتی ہیں۔

تصنیف کا ردِ عمل

تلگو نثری شاعری کا پہلا نثری اردو ترجمہ بیس نظموں پر مشتمل تھا۔ یہ میرا پہلا تخلیقی ترجمہ تھا۔ شائع ہوا تو میں بے حد خوش ہوا۔ چلو اب میں بھی "اہلِ کتاب" ہو گیا۔

دس جلدیں بیاگ میں رکھ لیں۔ ایک دوست کے گھر جا پہنچا۔ مولانا مہر الدین شونشاں۔ ایک نسخہ ان کی نذر کیا۔ امید تھی کہ قدیم دوست ہیں۔ "مبارک مبارک" کہہ اٹھیں گے۔ بغل گیر ہوں گے۔ دیوان خانے کی کھڑکی سے جھانک کر اپنی اہلیہ سے کہیں گے:

"بھئی۔ چائے بسکٹ اور کچھ مٹھائی بھیجو، ہمارے قدیم دوست غیاث صدیقی آئے ہیں۔ یہ آج سے صاحب کتاب ہو گئے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ"

ہر بار اپنا ناپسندیدہ لباس مجبوراً پہننا پڑ رہا ہو اور اُسے بار بار بدلنے کی زحمت ہو رہی ہو۔ خدا خدا کر کے منہ سے پھوٹے۔

"بھئی۔ یہ نثری شاعری تو میری سمجھ سے باہر ہے۔ اسے شاعری کیسے کہا جا سکتا ہے۔ نہ وزن، نہ قافیہ، نہ ردیف، قلم اٹھاؤ جو چاہو لکھ ڈالو"۔ میں نے عرض کی۔ "مولانا ضو فشاں، ناسخ کا ایک شعر سنیے:

جو اُس پری سے شبِ وصل میں رکاوٹ ہو
مجھے بھی ایک جنازہ ہو یا چھپر کھٹ ہو

اور میری نثری شاعری کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو:

"تم ایک حسین حادثے کی جان ہو
جو میری ہزاروں رگوں میں
ایک آنکھ بن کر جاگ رہی ہو۔"

ناسخ کے اوپر والے شعر میں وزن، قافیہ، ردیف ہیں۔ عروضِ مروّجہ کے مطابق یہ غزل کا ایک مطلع ہے لیکن اس میں شاعری یا تخیل کہاں ہے۔ شاعری کا (Spark) کہاں ہے۔ لیکن میری نثر میں وہ (Spark) موجود ہے۔ اس کے علاوہ پابند شاعری میں قافیہ، ردیف، اور بحر کی پابندی جان لیوا ہوتی ہے۔ قافیہ، ردیف اور وزن کو سنبھالنے میں حشو اور تاخیر و تقدیم کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ بڑے سے بڑا قادر الکلام بھی حشو، تاخیر اور تقدیم سے نہیں بچا ہے لیکن نثری شاعری میں کوئی بہانہ نہیں چل سکتا۔ نقاد کی گرفت مضبوط ہو جاتی ہے، اور شاعر ہر لفظ کو شعوری طور پر ناگزیر

سمجھ کر استعمال کرتا ہے۔ نہ قافیہ ردیف کا بہانہ اسے بچا سکتا ہے نہ بحر کا سہارا سپر بن کر نقاد کے وار کو روک سکتا ہے۔ ایک ایک لفظ شعوری طور پر استعمال کرنا پڑتا ہے اور ایک ایک لفظ کا حساب نقاد لے لیتا ہے تخلیق میں جس قدر آزادی دی جائے گی تنقید اسی قدر کس کر کی جائے گی۔ اس لئے نثری شاعری ہی میری نظر میں نہایت مشکل اور فطری تخلیق کہلائی جا سکتی ہے۔ حالی، شبلی کے علاوہ اردو اور انگریزی کے اعلیٰ درجے کے نقادوں نے شعر کے لئے وزن کو لازم نہیں قرار دیا ہے۔ اگر تخیل اعلیٰ درجے کا ہو، اظہار خیال کے لئے الفاظ میں حشو نہ ہو اور شاعر عجز کلام یا عدم قدرتِ بیان کا شکار نہ ہوا ہو، اور عروض کی پابندی کی جائے تو ایسا شعر موزوں، سونے پر سہاگہ کہلائے گا۔ آج کی مشینی تیز رفتار دنیا میں اعلیٰ اساتذہ کا خلوصِ فن، وقت، طالب علم کا حسنِ طلب اور ریاضت سوالیہ نشان بن گئے ہیں۔"

مولانا ضوفشاں نے فوراً کہا "غیاث صاحب آپ سے میں بحث نہیں کر سکتا۔ ثبوت، دلیل اور علم کا اظہار مجھ سے مشکل ہے۔ مختصر یہ کہ نثری شاعری دل کو نہیں بھاتی اور یاد بھی نہیں رکھی جا سکتی ہے..... بہرحال اس مجموعہ کلام کی اشاعت پر میں آپ کو مبارک باد دینا ہی بھول گیا۔" چلو چھٹی ہوئی۔ پچیس سالہ دوستی نے مبارک باد کا طمانچہ میری تخلیق کے رخسار پر جما ہی دیا۔ دل نے کہا چلو کھوسٹ آدمی ہے۔ شاعری کے میدان میں پچیس تیس سال پیچھے ہے۔ یہ مبارک ان سے غیر متوقع نہیں تھا۔

اس مولانا کے ہاں سے اب کہیں اور چلیں۔ ارے یاد آگیا، اپنے ترقی پسند
شاعر خورشید آفاقی کے ہاں چلتے ہیں۔

دروازے پر دستک دی تو نسوانی آواز نے نام پتہ، وجہ ملاقات
دریافت کی۔ دس منٹ کے بعد دروازہ کھلا۔ سوکھے مریل شاعر، پھٹی
بنیان، تہمد پر دو چار پیوند، اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، اور آنکھوں میں
[illegible] گردن تک لمبے لمبے بال، بس سارے جسم میں سب سے
نمایاں چیز بال ہی تھے۔ کالے بالوں میں نفیش کے تار تیل سے بے نیاز
سیاہ ہونٹوں میں چار مینار سگریٹ دبی ہوئی جیسے چنگاریاں تھوک رہی
[illegible] دو ٹوٹی ہوئی کرسیاں تھیں۔ ایک پر میں بیٹھ گیا۔ دوسری
پر میزبان۔

"کہئے غیاث صاحب کیسے آنا ہوا؟"

میں نے ایک نسخہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ انھوں نے نہایت
حقارت کے ساتھ کتاب پر نظر ڈالی۔ کتابت، طباعت وغیرہ سب کچھ
ان کی نظروں میں ہیچ رہا تھا۔ فوراً مسکرائے "مبارک، کتاب اچھی چھپی ہے۔"
پھر ورق گردانی شروع کی۔ "ناشر کوئی رجعت پسند ادارہ معلوم ہوتا ہے"
دو ایک نظمیں پڑھیں، پھر مسکرائے۔ "یہ نظمیں بہت خوبصورت ہیں لیکن
ان میں سماجی شعور کم نظر آتا ہے۔ مجھے بے مقصد زندگی اور بے مقصد شاعری
بالکل پسند نہیں۔ آپ کے ہاں تو ایک سے ایک بڑھیا قومی نظمیں ہیں۔ ان کو
کیوں نہیں چھاپا۔ یہ مجموعہ جس تلگو شاعر کا ہے اس کے ہاں بھی کئی مقصدی

اور قدرِ نظمیں تھیں ان کا انتخاب کیوں نہیں کیا۔ یہ مجموعہ آپ کے قریبی دوستوں کا
انتخاب معلوم ہوتا ہے۔ خیر آئندہ دوسری اشاعت میں یا دوسرے مجموعے میں
اُن اہم نظموں کو ضرور شائع کیجئے۔"

اندر سے کالی بیلی چائے، دو ٹوٹے پھوٹے مگوں میں آئی۔ چائے
میں شکر اور دودھ سے زیادہ خلوص تھا۔ پی گیا۔ شکریہ اور گرم گرم مصافحہ
کی سوغات لے کر وہاں سے نکلا۔

راہ میں ایک جدید شاعر کا گھر پڑتا تھا۔ موصوف "مجسم سمادھی"
کے نام سے مشہور تھے۔ پہلے شاعر کہلائے۔ بعد کو انھوں نے نقاد بننے کی
کوشش شروع کردی۔ حالاں کہ اردو سے ان کا تعلق اس قدر ہے کہ شعر الشعم
مقدمہ شعر و شاعری یا غبار خاطر کا ایک صفحہ صحیح تلفظ کے ساتھ نہیں پڑھ سکتے۔
بہرحال ان سے ملاقات ہوئی۔ بڑی خاطر کی۔ میں نے ایک نسخہ موصوف کو دیا
فوراً گلے لپٹ گئے۔ "مبارک، مبارک کیا خوبصورت گٹ اپ ہے۔۔
کاغذ، طباعت، کتابت، سرورق کس کس کی تعریف کی جائے۔ سبحان اللہ،
ماشاء اللہ، واہ واہ" کتاب نہیں کھولی تھی۔ میں نے کہا:
"ذرا پڑھ کے بھی تو دیکھئے ایک آدھ نظم" انھوں نے ورق گردانی
کی۔ "غیاث صاحب گو آپ کی شاعری کی عمر میری حقیقی عمر سے زیادہ ہے۔
لیکن شاعری اور تجربے میں آپ کو نو مشق کہہ سکتا ہوں۔ ارے نئی لفظیات
کے بغیر جدید شاعری کیسے ہو سکتی ہے۔ ترشہ، تیزاب، سگریٹ، حسن
مشام، [illegible] جیسے الفاظ و تراکیب کے بغیر جدید شاعری ہو ہی نہیں سکتی۔"

پہلا کام سلطانین دہ مظلم سمجھنا اور ماحول پر کرنا [illegible]
اور خصوصاً حیدرآباد میں صحافت کی گرفت "ادب" پر بہت مضبوط ہے۔
"صحافت" ایک تناور درخت ہے تو "ادب" اس کی ایک معمولی شاخ
بن کر رہ گیا ہے۔ اسی شاخ پر ادیب و شاعر و نقّاد بیٹھتے ہیں اور صحافت
کی جانب سے عطاکردہ آرے سے اسی شاخ کو کاٹنے میں اپنی عمریں صرف
کر دیتے ہیں۔

ادبی ڈکٹیٹر

میں ایک روزنامے کا ایڈیٹر ہوں، اگر ہفتے میں ایک بار ادبی ایڈیشن نکالوں تو ہفتہ وار کا ایڈیٹر کہلاتا ہوں اور مہینے میں ایک مرتبہ ایک نیم ادبی اور نیم فلمی ضمیمہ نکالوں تو ماہنامے کا ایڈیٹر بن جاتا ہوں۔ اس طرح میری پانچوں انگلیاں گھی میں رہتی ہیں۔ ایڈیٹر ہونے میں بڑے فائدے ہیں۔ قدیم زمانے میں لوگ پولیس کے امین سے جس طرح ڈرتے تھے آج روزنامے کے ایڈیٹر سے ڈرتے ہیں۔ ویسے بھی میں اپنے ملک (دفتر) کا بادشاہ ہوں۔

آج کا سب سے بڑا ہندوستانی مرض، بین الاقوامی مرض شہرت کا مرض ہے، اور ظاہر ہے کہ میں اس مرض کا علاج آسانی سے کر سکتا ہوں۔ میرے قلم کی نوک پر حیات و ممات کی شہرت کا انحصار ہوتا ہے۔ میں نے جسے چاہا تہہ زمین دفن کر دیا، جسے چاہا آسمان پر پہنچا دیا۔

زحمت کے [illegible] پر شب ہوتی ہے۔ سارے شہر کی چغل خوری کرنے کے بعد میرے پیچھے یقین والے تھے کہ لیڈر، تاجر، پروفیسر، ادیب شاعر، اور دانشور تک اپنی تصاویر اور اپنے کارنامے لے کر میرے دفتر چلے آتے ہیں۔ سب کے سب شہرت کے مریض اور میں ان کا "تارا مسیح"
پچیس روپے میں جنت کی سیر کرا دیتا ہوں۔ ؏

زمیں پہ تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

بہت کم ایسے ہوں گے جو کہیں گے۔

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سر بلند کیا کرتے

میرا مسلک غیر جانب داری ہے۔ چرچل نے غیر جانب داری پر عجیب تبصرہ کیا تھا۔

"باضمیر اور باشعور آدمی، ظالم اور مظلوم میں تفریق کرتا ہے پھر مظلوم کا ساتھ دیتا ہے لیکن بے ضمیر یا بے شعور یا تو ظالم کا ساتھ دیتا ہے یا مکار اور غیر جانب دار بن جاتا ہے۔" اب آپ کچھ بھی کہیں میں تو ایڈیٹر ہوں۔ دو لیڈروں کے متضاد بیانات پیش کرتا ہوں یا دو مدعیوں کے اشتہارات ایک ہی زمین کے تعلق سے ایک دوسرے سے متصل شائع کرتا ہوں۔ مجھے درم و دام سے غرض ہے۔ کاتب، خوش نویس، کلرک، چپراسی اور کئی سب ایڈیٹروں کی محنت، خون پسینہ، اُن کا تجربہ اور علم صحافت [illegible] لئے شاندار مکان خوب صورت لمبی موٹریں، تعیش اور آرام دہ زندگی فراہم کرتے ہیں۔ اس عمل

کو استحصال یا مجبور عوام کا خون چوسنا نہیں سکتے بلکہ عوام مجھے ایسے عمل سے جائز حق دار سمجھ کر میری صدارت میں ادبی جلسے کرتے ہیں اور میرے ہاتھوں اعلیٰ درجے کی ادبی کتابوں کی رسم اجرا بھی انجام پاتی ہے۔ رسم اجرا کے وقت جو مضمون پڑھتا ہوں۔ وہ کسی سب ایڈیٹر کا لکھا ہوتا ہے ـــــ وہ بے چارہ سب ایڈیٹر مضمون تو لکھ دیتا ہے لیکن ہر لفظ کو اعراب لگا کر صحیح تلفظ سے مجھے آگاہ کرنے کی جرأت کیسے کر سکتا ہے۔ میں بھی پڑھتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ میری علمی لیاقت کی قلعی کھل جاتی ہے کیا کروں جب کسی لفظ کو اضافت کے ساتھ پڑھ دیتا ہوں تو پڑھے لکھے لوگ منہ پھیر کر مسکراتے ہیں۔ بڑے بڑے نقاد تو میری جیب میں رکھے ہیں۔ ان کے ضمیر ان کے شاندار مستقبل کے تلے دبے پڑے ہیں۔ اگر وہ میرے خلاف علانیہ منہ کھولیں تو میں یونیورسٹی میں بھی با اثر ہوں وہاں اُن کی ترقی کے پاؤں آگے بڑھنے سے پہلے ہی کاٹ دے سکتا ہوں۔ میرے وفاداروں میں ادیب، شاعر، اعلیٰ عہدہ دار، پڑھے لکھے بڑے بڑے لیڈر اور دانشور تک ہیں۔ ان کی دعوتوں پر کیا خرچ اٹھتا ہے، ان کے ایک اشتہار سے ہزاروں روپے کے اشتہار مجھے مل جاتے ہیں

میرے اخبار کی پالیسی بظاہر سیکولر ہے لیکن مذہبی فسادات کی خبروں پر جلی حروف میں سرخیاں لگا کر مذہبی جنونیوں کو خوش کر دیتا ہوں اور مظلوم و مجبور مزدوروں پر حکومت کی زیادتیوں کی خبریں خطِ خفی میں شائع کر کے حکومت کے ارباب اقتدار کا منظورِ نظر بن جاتا ہوں۔

پیرس میں ایک تقریب سے ملنے کا وعدہ تھا، خیال فرصت کا آگیا
لیکن دوست احباب کی ضد نے مجھے حج کر لینے پر مائل کر کے ہی چھوڑا۔
حج کرنے میں بڑے فائدے ہیں۔ نام کے ساتھ الحاج لگ جاتا ہے اور مذہبی
جماعتوں، جلسوں، اور مشاعروں کی صدارت ہاتھ آتی ہے۔ اب تک تو میں
اپنے چمچوں کو سیکولر اسٹیج سے پیش کرتا رہا تھا اب الحاج ہونے کے بعد
مذہبی اسٹیجوں سے بھی اپنے چمچوں کو چمکا سکتا ہوں۔ میری مذہبی اداکاری
پر لوگ تنقید کرتے ہیں تو وہ تنقید ہوٹلوں اور گھروں تک محدود رہ جاتی
ہے۔ کوئی بڑا اخبار میرے خلاف لکھنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ گذشتہ
ہفتے ایک معمولی ہفتہ وار میں لکھا تھا کہ الحاج فلاں (یعنی میرا نام لکھ کر)
ناخن نہیں تراشتا۔ انگلیوں کے ناخن میل بھر کر سیاہ ہلال بن جاتے ہیں
اس طرح وضو نہیں ہو سکتا تو نماز کیسے طرح ادا ہو سکتی ہے۔ حالاں کہ میں نے
اسی حالت میں وضو بھی کیا ہے۔ نماز بھی پڑھی ہے، اور نماز ادا بھی ہو گئی ہے
مجھ پر تنقید تو ہوئی لیکن کسی بڑے اخبار نے نوٹس نہیں لی۔ مگر میں نے احتیاط
شروع کر دی ہے۔ اب کم از کم بظاہر پاک عادتیں بنالی ہیں۔ رمی (جوا)
اور کلب چھوڑ چکا ہوں۔ پھر بھی قیمتی شرابیں گھر میں رکھنی ہی پڑتی ہیں تاکہ دانشور
طبقے کی مقدس تواضع کی جا سکے۔ میرے جاسوس چپے چپے سارے شہر کا احاطہ
کیے ہوئے ہیں۔ کئی ادبی انجمنوں میں سیاسی پارٹیوں میں، مذہبی کمیٹیوں میں
تک میرے وفادار موجود ہیں۔ شہر کے سب سے بڑے مشاعروں کی فہرست
میں مرتب کرتا ہوں۔ لیکن مشاعرے کا کنوینر اپنے کسی چمچے کو مقرر کرتا ہوں۔

شہرت میں اس بات کا خیال رکھتا ہوں جو میری لغش برادری کر سکیں جیسے اشاروں پر ناچیں، وہ اس قدر نکمے ہوں کہ ان کو میری سفارش، میری اور میرے اخبار کی شہرت بروقت درکار رہے وہ کسی میدان میں کبھی خود مکتفی نہ ہو سکیں ایسے ہی شاعروں کو میں صفِ اول میں جگہ دے کر اس قدر پروپگنڈہ کرتا ہوں کہ گاؤں گاؤں ان کی شہرت ہو جاتی ہے، اور ان کی مارکٹ ریٹ بڑھ جاتی ہے۔ میں اپنے فرض میں کوتاہی نہیں کرتا لیکن اس کو کیا کروں کہ کم بخت قریہ قریہ مشاعرے پڑھتے ہیں، عوام سے روپے بٹورتے ہیں، سگریٹ، پان شراب کی فرمائشیں کرتے ہیں، مگر مشاعروں میں یا ادبی گفتگو میں خود کو جاہل ثابت کرکے لوٹ آتے ہیں۔ اس طرح دوسرے مشاعروں میں مجھے ناموں کی ترتیب بدلنی پڑتی ہے۔

پڑھے لکھے لوگ کہتے ہیں کہ "میں اردو میں دس صحیح جملے نہ لکھ سکتا ہوں نہ پڑھ سکتا ہوں نہ بول سکتا ہوں۔" مگر ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی فریاد بن جاتی ہے۔

یہ تو میری زندگی کا ایک رخ ہوا۔ اب دوسرا رخ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ میں کتنا مجبور ہوں اور کتنا مختار ہوں۔

میں بہت پڑھا لکھا نہیں ہوں لیکن اچھے برے کی تمیز ضرور رکھتا ہوں۔ ایک صاحب قریبی عزیز ہیں۔ بس ایک پھیکی سی غزل لے کر چلے آئے۔ مروت کے مارے غزل بھی چھاپ دی اور معاوضہ بھی دے دیا۔ ایک شاعر، مکمل شاعر، یعنی شراب، لمبے بالوں اور ترنم کی جیبیا کھیوں پر

آتے ہیں۔ ہر بڑے مشاعرے میں شرکت کے لئے یہ بڑی بڑی سفارشیں (یعنی میرے چمچوں کی سفارشیں) لے کر آتے ہیں۔ مجبوراً ان کو مشاعرے میں شرکت کی دعوت دینا پڑتا ہے۔ میں جانتا ہوں یہ شاعر مشاعرے کے اختتام پر بڑے فخر سے سینہ تان کر عام لوگوں میں کہتے پھریں گے کہ ان کے بغیر مشاعرہ ہی منعقد نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی جھوٹ صرف شیخی کی حد تک ہے۔ بمبئی میں مشاعرے پڑھے، لکھنؤ میں، کشمیر میں اور آخر کو بی بی سی سے بھی مشاعرے پڑھنے کے دعوے دار بن جاتے ہیں۔ اپنے اساتذہ میں فانی، جگر سے لے کر اقبال تک کو گنواتے ہیں۔ موصوف بہت مرنجان مرنج اور بے ضرر شریفِ آدمی ہیں۔ ان کی شخصیت سے شاعری اور شہرت کی بھوک کو علیحدہ کر دیا جائے تو دوستوں کو ٹوٹ کر چاہنے والا آدمی سامنے آجاتا ہے۔ شاعر کو شیخی کی چھوٹ تو دینا ہی چاہئے۔ ویسے یہ بھی میرے ایک چمچے کے لے پالک ہیں اس کی دم کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔ ان کی عدم موجودگی میں ہر شخص ان کی علمیت پر ہنستا ہے۔ ان کے متعلق دو رائیں نہیں ہیں۔

میرا دفتر ایک کاروباری دفتر ہے۔ یہاں نوابوں اور جنگ والوں کی اولاد کے لئے دیوان خانہ کہاں سے لاؤں۔ کچھ مرحوم نوابوں کی اولاد ہے ہنر اور کچھ نام نہاد خاندانی حضرات میرے دفتر کو خالہ کا گھر سمجھ کر ایسا جم کر بیٹھ جاتے ہیں کہ سارا خفیہ کاروبار معطل ہو جاتا ہے۔ یہاں میری مروت اور وسیع القلبی کام آتی ہے برداشت کر لیتا ہوں۔

میرے دفتر میں خوب صورت خواتین، شاعرات بن کر آتی ہیں یا ہم

مشاعروں میں شرکت کے لیے اپنا نام اور بیاض اور دس بیس چیسں تری ... جبور
انھیں مدعو کرنا پڑتا ہے اور میں بھی انتقاماً ان کو مشاعرے کے اسٹیج پر
مہمانان خصوصی کے دائیں بائیں ڈھکیل دیتا ہوں. مہمان ادھر خوش، شاعرات
ادھر خوش، میرا کیا بگڑتا ہے.

آج انسان کچھ نہ ہو صرف ایک روزنامے کا ایڈیٹر بن جائے تو
سمجھئے سب کچھ ہو چکا. کبھی میں ربر کی چپلیں پاؤں میں ڈالے ٹوٹی پھوٹی
سائیکل گھسیٹتا پھرتا تھا. اشتہارات کے لئے اور چندوں کے لئے جن کے
سامنے جھولی پھیلاتا تھا، آج میں اُن کے سلام کا منتظر رہتا ہوں، اگر وہ
سلام میں پہل کرتے ہیں تو میں فارن سگریٹ ہونٹوں میں دبائے صرف
سر ہلا دیتا ہوں.

میرے بچے میرے ماضی سے واقف نہیں ہیں، بیوی واقف ہے
بھول جانا چاہتی ہے. رشتے دار، عزیز، میری امارت ہر دلعزیزی اور
شہرت سے مرعوب ہیں. اور مجھ سے قرابت ہونے پر فخر کرتے ہیں.

بعض مرتبہ افسروں کی خوشامد خود مجھے کرنی پڑتی ہے. ان کی تصویریں
سوانح حیات اور ان کے کارنامے شائع کرنے پڑتے ہیں. اور ان کو بڑا ادیب
بھی ثابت کرنا پڑتا ہے یہی سلوک مجھے اپنے لئے "مفید" شاعروں، ادیبوں
نقادوں اور دانش وروں کے ساتھ کرنا پڑتا ہے. اور یہیں میرا ضمیر مجروح
ہو جاتا ہے. کیونکہ اس طرح میں ادب کی ایک جھوٹی تاریخ مرتب کرتا ہوں.
یہ خیال آتا ہے آنے والے محققین مجھے گالیاں دیں گے. ابن الوقت ٹھہرائیں گے

مجھے بیدرد اور بے ضمیر جاہل ثابت کریں گے۔ یہیں میرے قدم ڈگمگاتے ہیں
اللہ کا احسان ہے کہ میرا ضمیر ابھی زندہ ہے اور میں اپنی کوتاہیوں، ناانصافیوں
اور زیادتیوں کو محسوس کرتا ہوں۔ میرا ضمیر صرف اس وجہ سے زندہ ہوگا کہ
میری رگوں میں بزرگانِ ملت اور شرفائے شہر کا خون رواں دواں ہے۔
کاش اگر کوئی ایسا موقع ہاتھ آجائے کہ میں مرنے سے پہلے نقادوں اور
دانش وروں کو ان کے ضمیر لوٹا سکوں۔ میرے احسانات کے تلے ان کی
دبی ہوئی زبان کو قوتِ گویائی واپس کر دوں تاکہ اپنے کئے پہ پچھتائے ہمارے ادبا
جرائم کا کفارہ ادا ہو جائے۔ اور میں ادب کی جھوٹی تاریخ مرتب کرنے والا گنہگار
نہ کہلاؤں۔ خدا کے فضل و کرم سے مجھے دولت، عزت، شہرت سب کچھ
مل چکا ہے۔ مستقبل کا مورخ ادب مجھے "ضمیر فروش" حقائق ناشناس ادب
کے خطابات نہ عطا کرے۔

میرے مالک! مرنے سے پہلے مجھے ایک موقع عطا فرما کہ میں اپنے
دامن سے "چمچہ نوازی" "خوشامد پسندی" "بے ہنر نوازی"، اور ادبی ڈکٹیٹری
کے دھبے دھو ڈالوں۔ اور ادب کے ڈکٹیٹر کی بجائے ادب کا ادنیٰ خدمت
گزار کہلاؤں۔

شوخ چشمی

میں ایک اخبار کے ایڈیٹر اور جوائنٹ ایڈیٹر کا چپراسی ہوں۔
ان کا رُخ جس طرف ہوتا ہے میں بھی اسی سمت اپنا چہرہ گھماتا رہتا ہوں
اور تابعداری کے لئے ہمیشہ ان کے روبرو سر جھکا کے ہاتھ جوڑے کھڑا
رہتا ہوں۔ اس لئے مجھے سب لوگ "شوخ چشم" کہتے ہیں۔ مجھے یہ
خطاب دینے والوں کی اکثریت ادیبوں، صحافیوں، شاعروں اور دانشوروں
کی ہے۔ حالانکہ میں جو کام کھل کر علانیہ کرتا ہوں وہ کام مجھے خطاب
دینے والے لوگ سب چھپ کر یا اپنے گھر میں کیا
کرتے ہیں۔ اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ میں ریاکار ہوں یا مجھے یہ خطاب
دینے والے؟

میں "یک در گیر محکم گیر" کا قائل ہوں۔ میں نے ایسے ایڈیٹر کو

پھانس لیا ہے جو سارے جہاں کا شکاری ہے [illegible]
پاس (بے حساب) دولت ہے۔ کچھ مذہبی، لسانی، اور ادبی ٹرسٹوں
کا سرپرست ہے۔ عوام کو اور حکومت کو اپنی شرافت اور حب الوطنی
کا یقین دلانے کے لئے ایک جمہوری طریقہ ہے وہ یہ کہ پہلے پردے
میں بلاک مارکیٹنگ کرو، غبن کرو، جمہوریت کے پردے میں ڈکٹیٹرشپ
یا بادشاہیت یا نوابیت چلاؤ، لیکن ظاہرداری میں بگلا بھگت بنے رہو
کچھ مذہبی، کچھ لسانی، کچھ ادبی ٹرسٹوں کے لئے رقم جمع کرو، اور ٹرسٹ
پر ٹرسٹ بناتے جاؤ۔ اخبار اپنا، اشتہار اپنا، پروپیگنڈا اپنا۔ اور
کیا چاہیئے !

میرا اصلی نام سراغ رسانی اور چغل خوری ہے۔ میں ان کے کفش
بردار دلال کا کفش بردار ہوں۔ اپنے مالک کے مخالفوں کی فہرست بنا کر
کام شروع کرتا ہوں۔ مخالفین نے ایک کہا تو میں اس کو اپنی صلاحیت سے
دس گنا کر دیتا ہوں۔ پھر ایڈیٹر اور جوائنٹ ایڈیٹر کے
روبرو اپنا رپورتاژ (چغل خوری) پیش کر کے ان کو کس قدر خوش کر دیتا ہوں
اس کا اندازہ کرنے کے لئے میرے ضمیر سے میری جیب تک آپ کو روحانی
اور مادی سفر کرنا پڑے گا۔

کچھ سال قبل میرے چہرے پر ایگزیما کی وجہ سے سیاہی آگئی تھی
شہر کا ہر شخص کہنے لگا کہ یہ سیاہی میری چغل خوری کا اور دشنام طرازی
کا نتیجہ ہے۔

میرا فن، میرا ایمان ہے۔

اس دنیا میں تو میں مگن ہوں اور کامیاب ہوں۔ ع

عاقبت کی خبر خدا جانے

میری تخلیقات تیسرے درجے کی تھیں لیکن مجھے پہلے درجے کا اسٹیج حاصل ہے۔ میزبان اور مہمان دانشور میری تخلیق پر ہنستے تھے لیکن میرے مجازی مالکین کے سامنے میرا پول نہیں کھول سکتے۔ اس کے لئے میں مختلف قسم کے حربے استعمال کرتا ہوں جن کا انکشاف نہ صرف میرے لئے مضر ہے بلکہ یہ خوف ہے کہ آئندہ مجھ جیسی نسلوں کے لئے بھی سب راستے بند ہو جائیں گے۔ کیوں؟ کیا مجھ جیسے لوگوں کو آئندہ پیدا نہ ہونا چاہیئے؟

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن

اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

اس شعر کو پڑھ کر آپ کہیں گے حدیث شریف کی طرف اشارہ ہے۔ "امت کے علماء میں اختلاف دین کی اشاعت کا باعث بن سکتا ہے" درست۔ لیکن مجھے اعلیٰ مضامین و مفاہیم نکالنے کی نہ ضرورت ہے نہ فرصت، مجازی مالکین کی خدمت (چغل خوری) سے فرصت ہو تو حقیقی مالک کی طرف دھیان [illegible] سکتا ہوں۔ [illegible] میرے جانے کے بعد مجازی مالکین نے میرے لئے ایک گنبد بنانے کا بھی یقین دیا ہے انشاء اللہ کبھی نہ کبھی سورج مکھی گنبد بننے کے لئے بھی ہمارا اخبار

ہ   مانگے پہ ابھرآئی ہے دل کی کالک   (داغ)

میں نے اپنے کارناموں میں پچاس فی صدی کمی کردی ہے، یعنی "گالیاں دینا" چھوڑ دیا ہے۔ دیکھئے اللہ (ایڈیٹر) کے فضل سے میرے چہرے سے نصف سیاہی چھٹ چکی ہے۔ گالیاں دینا دراصل میں نے بچپن میں اپنے ماحول سے سیکھا تھا۔ بڑے سے بڑے آدمی کو بھی نہایت دریدہ دہنی سے بڑی سے بڑی گالی دے سکتا ہوں۔ اس فن کے لئے ایڈیٹر اور جوائنٹ ایڈیٹر کو ملعون مت کیجئے، اگر میرے مالکین کے خلاف میرا باپ بھی کچھ کہے تو وہ بھی وہی گالی سنے گا جو دوسرے سنتے ہیں۔

میرے مجازی مالکین کے حکم پر میں کسی کے خلاف پروپیگنڈا کرتا ہوں۔ نشے سے سرشار نعت سنانے والے گوئیے کو شراب کی ایک پیگ والی سیل بند شیشی پیش کرسکتا ہوں کسی بڑے آدمی کے دائیں بائیں حسیناؤں کو ڈھکیل سکتا ہوں۔

پھر مجھے اندرون ریاست اور بیرون ریاست کے مشاعرے اور ان کے بڑے بڑے معاوضے ہاتھ آتے ہیں۔ اخبار میں میرا نام ایک ماہ میں کم ازکم پندرہ دنوں تک مختلف کارناموں کی وابستگی کے ساتھ چھپتا رہتا ہے۔

پھر بڑے آفیسر کو سلام مارنا، ان کے ناموں کو ادبی اسٹیجوں کی زینت بنانا، شہرت دینا، اخبار سے ان کا قریبی ربط رکھنا میرا پیشہ

ہمارے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ جن میں خوش نویسوں اور
کاتبوں کی اصلاحیں تک بھی شامل ہیں۔ ویسے بھی ہم ان کے احسان مند
ہیں کیونکہ اصلاح کے علاوہ کم ریٹ پر کتابت، ڈسکاؤنٹ، اور ضیافت
کے صدقات ہم ان سے وصول کرتے رہتے ہیں۔

ہمارے مجازی مالکین اس قدر بھی شریف نہیں ہیں کہ ہم کو
اپنے مقصد اس قدر اوازیں۔ دراصل ہم ان کے گھر کے بھیدی ہیں۔ ہم
ان کے سارے سیاہ کارناموں سے واقف ہیں۔ ان کا ماضی اور حال، ظاہر
و باطن، اصلیت اور ڈھونگ، دولت و غربت، غرض ہر کارنامہ ہمارے
حافظے [illegible] محفوظ ہیں اور ہم کو [illegible]
بھی ہیں۔ یہ زندگی ایک لمبی دوڑ کا نام ہے۔ ممکن ہے کہ اپنے راز پوشیدہ
رکھنے کے لیے کبھی ہماری [illegible] عزت سے کھیل جائیں یا ہم
اپنی [illegible]۔ مالک حقیقی ہی جانے کہ کس کا وار
پہلے چلے گا۔ کیونکہ دونوں تلوار کی دھار پر ہیں۔

ایک بات وضاحت طلب ہے کہ ہم اپنے مجازی مالکین کے
اشارے پر لوگوں کو گالیاں دیتے ہیں تو بات یہ ہے کہ جس کے پاس جو کچھ
ہوتا ہے لوگوں کو وہی کچھ دیتا ہے۔ ہم کو زندگی بھر جو بھی ملا (عوام کی گالیاں)
ہم وہی تقسیم کر رہے ہیں۔

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

کے پٹ ادھر بند ہو گئے۔

پٹروسن کی آواز کا مقابلہ شاید سہگل بیگ سنگر ہی کر سکتے تھے اور گانا بجانا چھوڑ دیجئے۔ وہ ملازم کو ڈانٹتے تو ایسا معلوم ہو کہ ساز کھنک رہا ہے۔ جلترنگ بج رہے ہیں۔ اس پر غضب میری بیوی کا بیان۔ "ہائے بدا جی کا چہرہ بالکل کامنی کوشل میں ملتا ہے، لیکن آنکھیں نرگسی ہیں۔ کامنی کوشل سے زیادہ حسین۔"

مخفی مبادا کہ مجھے کامنی کوشل کے چہرے کے خطوط بھی پسند تھے اور میں نے اپنی بیوی کے روبرو اس پسند کا اعتراف بھی کیا تھا۔ میرے دل میں کبھی کوئی برائی نہیں آئی۔ پٹروسن کے شوہر جب زندہ تھے اس وقت انھوں نے دو ایک مرتبہ اپنی اور میری بیوی کو بے پردہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ میری بیوی نے اس آفر کو مسترد کر دیا تھا، کیونکہ اس کو مجھ سے خوف تھا۔ ایک تو میں شاعر، دوسرے پٹروسن کی آواز کا مداح اور وہ خود بھی پٹروسن کی خوبصورتی کی مداح رہیں۔

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ بے چاری بیوی تک ہو گئی لیکن مجھ سے آمنا سامنا نہ ہوا۔

یہ بات فطرت کے مطابق ہے کہ اگر کسی سے کوئی چیز چھپائی جائے تو اسے دیکھنے کی خواہش بڑھ جاتی ہے۔ پٹروسن کے نہ تو [illegible] نہ اولاد۔ ایک [illegible] بارہ سال کا لڑکا نوکر رکھ لیا تھا، وہی گھر کے کام کاج

کر دیتا تھا۔ وہ ایک مکانات اور وہ ایک ٹیلیفون لے رہا ہے۔ ہے رسالہ
کی گاڑی چل رہی تھی۔ کبھی لائٹ کٹنے کی نوبت آتی یا پراپرٹی ٹیکس وصول
کرنے والا بل کلکٹر آتا تو پڑوسن میری بیوی سے کچھ رقم بطور قرض
طلب کرتی۔ اس وقت میں کھڑکی کے قریب ضرور پہنچ جاتا تاکہ اتنا تو سن سکوں
ساغر کیسے کھنکتے ہیں؟ بلور فرش پر گر کر چھن سے کیسے اٹھتا ہے۔ جو بہرحال
کانوں سے دیکھنے کی کوشش کرتا۔ کیوں؟ کیا کانوں سے نہیں دیکھا جا سکتا؟
دیوار کے پیچھے دوسری جانب اگر آپ کا کوئی شناسا بات کرے تو کان
آواز سن کر پہچان لیتے ہیں کہ کون ہے اور فوراً اس کا چہرہ آپ کی آنکھوں
کے سامنے آجاتا ہے۔ ایسے کان "بینا کان" کہلاتے ہیں۔ جن کانوں میں یہ
صلاحیت نہیں ہوتی وہ "اندھے کان" کہلاتے ہیں۔ اسی طرح بعض آنکھیں
بھی کہانیاں سناتی ہیں۔ سامنے بیٹھنے والوں کی آنکھیں وہ کہانیاں سن لیتی
ہیں تو ایسی آنکھیں "سننے والی آنکھیں" کہلاتی ہیں۔ اور جو آنکھیں سننے کی
صلاحیت نہیں رکھتیں انہیں "بہری آنکھیں" کہا جاتا ہے۔ رعایت لفظی کے
ساتھ اسی مفہوم کا ایک شعر میرے پہلے مجموعۂ کلام "آواز کا رنگ" میں موجود
ہے۔

جب سے تعبیر خواب الٹی ہے
کان اندھے ہیں آنکھ بہری ہے

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ پڑوسن کی آواز کبھی نغمہ بن جاتی ہے تو کبھی دھنک
بن کر آنکھوں میں لہراتی ہے۔ میری بیوی عام معاملات میں بھولی ہے لیکن

اپنا الو سیدھا کرنے میں ماہر ہے۔ جب کبھی اس کی فلم دیکھنے کی خواہش ہوتی
ہے۔ اس روز وہ میز پر معمولی ڈشس کے علاوہ ماشت کباب، [illegible]
براؤن اسٹو یا رشین پڈنگ کا اضافہ کر دیتی ہے۔ اس طرح کا طعام خاص
دیکھ کر فوراً میرا ہاتھ اپنی جیب کی طرف چلا جاتا ہے، اور میں پاکٹ کو
بائیں ہاتھ سے مضبوط پکڑ کر دائیں ہاتھ سے کھانا شروع کر دیتا ہوں۔
اُدھر بیوی شروع ہوتی ہے: "اجی، بے چاری [illegible] سے کچھ یاد سے
کوئی پکچر نہیں دیکھی ہے۔ آج مجھ سے کہہ رہی تھی کہ دلن کا سنیما دیکھنا ہے
بشرطیکہ آپ اجازت دیں۔" میرے گھر کا یہ اصول ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں
کی شادی ہو جانے تک انہیں فلم دیکھنے کی اجازت نہیں دی جاتی ہے۔
اس لئے میری بیوی فلم دیکھنے کو چھپ چھپا کر جاتی ہے۔ اس معاملے میں
وہ بہت ہوشیار ہے۔ اپنی خواہش کو ہمیشہ کسی کے کندھے پر رکھ دیتی
ہے اور معصوم و بے بس بن کر سامنے آتی ہے۔ کبھی کسی پڑوسی کی بیوی کی
خواہش میں لپٹی ہوئی۔ کبھی نند کی آرزو بن کر، [illegible] میں
پکچر کی آرزو انگڑائیاں لیتی رہتی ہے۔ آخر کو یہاں تک بھی ہو چکا ہے کہ
میں رات کا کھانا کھا کر آرام لے رہا ہوں۔ وہ آئی، "اجی، یہ ہماری [illegible]
کیسی بے وقوف [illegible] نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟" "کہنے لگیں آج تک
اس نے کوئی پکچر نہیں [illegible] سوچتی ہوں کہ ایک پرانی پکچر "مغل اعظم" کم
کے قریب لگی ہے، غریب کو دکھا لاؤں۔" میں نے کہا، "ضرور ضرور، ورنہ
اس کی عاقبت خراب ہو سکتی ہے۔" وہ ہنس پڑی اور باورچن کو اپنی پرانی

ساڑھی اُڑھا کر آٹو رکشا میں ساتھ لے کر چل دی۔ پس خسر کی بیوی بھی بٹھا کر باورچن تک "پکچر دیکھنے کی تمنا" کیسے کیسے روپ بھرتی ہے۔

ایک روز پڑوسن کے ساتھ پکچر کو یہ نکلیں اُدھر علامہ مہر الدین خوشاں یہ یک بیٹی والی ریش سفید آدھمکے۔ "ڈاکٹر آج کا اخبار دیکھا؟" میں نے کہا "دیکھا" وہ بولے "خاک دیکھا" ارے سکندرآباد میں وہ پکچر لگی ہے کہ کسی ایکٹریس کے جسم پر بالشت بھر کپڑا نظر آجائے تو ایک سو روپیہ جرمانہ دینے کو تیار ہوں انگریزی فلموں کی بات ہماری ہندی فلموں میں کہاں آسکتی ہے۔" میں نے کہا "علامہ آج میں نے نفل روزہ رکھا ہے۔" علامہ بو کھلا سے گئے۔ "دیکھو ڈاکٹر، میں اس بات کا قائل ہوں کہ چھوٹے موٹے گناہ یاروں کے گناہ کر لے اور بڑے بڑے عملی گناہوں سے بچ جاؤ۔" میں نے کہا "مجھے آپ کے اس نظریے سے صدفی صد اتفاق ہے۔ اسی لئے تو آج نفل روزہ رکھا ہے۔" مولانا بولے۔ "یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے کہا۔ ارے، آج پڑوسن میرا روزہ کھلوا رہی ہے۔ ڈیڑھ والی کھڑکی کھلتے ہی ساغر کھنکنے کی آواز بار بار آئے گی۔ یہ لو سالن، یہ لو روٹی، یہ چاول یہ میٹھا۔" علامہ تھوک نگل کر بولے۔ "میں نے بھی بہت کوشش کی لیکن آپ کی پڑوسن کی زیارت نصیب ہی نہیں ہوئی، بڑا گاڑھا پردہ کرتی ہے۔ پھر بھی ڈاکٹر میں کہتا ہوں جب آپ کی بیوی کہتی ہیں کہ چہرہ بالکل کامنی کوشل کا سا ہے تو پھر زیادہ تردد کی بات کیا ہے۔ کامنی کوشل کے منھ سے ساغر کی کھنک والی آواز، خیال ہی خیال میں سن لو، پڑوسن حاضر ہے۔" میں

نے کہا۔ علامہ، میں چہرے اور آواز کو نہیں ملا پا رہا ہوں، جیسے ربر کی گڑیا کو تیل میں ڈالنے سے شکل انتخاب کہاں ہوتا ہے۔" علامہ بولے۔ تو پھر ایک ترکیب کرو۔ میرے گھر میں دعوت دی جائے۔ وہاں میں ایسا انتظام کرواؤں گا کہ چہرے کی شناخت ہو ہی جائے گی۔ میں نے کہا۔ "اب اس کی ضرورت نہیں۔ اس اتوار میری بیوی اور پڑوسن میٹنی شو دیکھنے کو جا رہی ہیں۔ میں وہیں جا کر درشن کراؤں گا۔" مختصر سا یہ کہ مولانا جب بھی میرے گھر تشریف لاتے ہیں میری بیوی بڑبڑانے لگتی ہے۔ "علامہ آئے ہیں، اب لے جائیں گے آپ کو نگوڑی انگریزوں کی ننگی فلمیں دکھانے کو۔" اتوار کو دو بجے دونوں پکچر کے لئے نکلیں۔ ادھر میں بھی آٹو میں ان کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ دونوں پکچر ہاؤس میں داخل ہوئیں اور میں قریب کی ایک دوکان میں گھس گیا۔ میں نے ان پر نظر رکھی تھی۔ جوں ہی وہ ٹکٹ لے کر اوپر چلیں میں بھی اسی ونڈو سے ٹکٹ لے کر ساتھ بڑھا۔ چونکہ سیٹیں بہت خالی تھیں اور منتظمین نے سیٹ کے انتخاب میں آزادی دے رکھی تھی، اس لئے منہ پر دستی رکھ کر کھانستا ہوا ہال میں داخل ہوا اور لباس سے اپنی بیوی کو پہچان لیا۔ ان سے تین قطاریں چھوڑ کر پیچھے کی جانب اپنے لئے سیٹ پکڑ لی۔ وہاں بیگ رکھ دیا اور باہر واپس آ گیا۔ جب اندھیرا چھایا تب اپنی سیٹ پر پہنچ گیا۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ دونوں وہاں سے اٹھ کر ٹھیک میرے سامنے والی سیٹوں پر آ گئی تھیں۔ دونوں کی ہنسی، کمنٹس سب کچھ سن رہا تھا۔ ساغر کھنک رہے تھے، اور بعد فرش پر گر کر ٹوٹ رہے

تھا۔ شکسپیئر کے آخر کو انٹرول ہوا اور میں فوراً منہ پر دستی ڈال کر کھانستا باہر آگیا۔ پھر دروازے سے جھانکنے کی کوشش کی لیکن پڑوسن نے ساڑی کا پلو سر پر اس طرح اوڑھ لیا تھا کہ چہرہ نظر نہ آ سکتا تھا۔ انٹرول ختم پھر پکچر شروع ہوئی۔ وہی کشمکش وہی ہنسی کے فوارے۔ مجھے اپنا ایک شعر یاد آیا۔

چاندنی تھی کہ ہنسی سب پہ برس جاتی تھی

اس کی نظروں میں کوئی اپنا پرایا بھی نہ تھا

جیسے ہی کھیل ختم ہوا میں تیزی سے آگے بڑھ گیا اور عزم کر لیا کہ خواہ کچھ ہو جائے اب تو آمنا سامنا ہوگا ہی۔ میں EXIT سے باہر آیا۔ سیڑھیاں اتر کر باقاعدہ اس طرح کھڑا ہو گیا کہ کسی صورت نشانہ خطا نہ ہونے پائے۔ چنانچہ میری بیوی آگے آگے اور اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے پڑوسن آ رہی تھی۔ ادھر میری نظر اُن پر پڑی اُدھر اُن کی نظر مجھ پر پڑی۔ ایک چیخ کے ساتھ وہ میری بیوی کی پشت میں جا چھپ گئی۔ لیکن اس وقت تک میں سب کچھ دیکھ چکا تھا۔ چھوٹے چھوٹے دیدے گڈھے جیسے، چپٹی ناک، پچکے گال، عمر مردوں کا نصیبا۔ رنگ سرخ و سفید لیکن بال؟ ہزاروں سفید بالوں میں ایک آدھ کالا بال۔

خدا کی پناہ۔ بارہ برس پڑوس میں رکھ کر میری بیوی مجھے کامنی کوشل کا دھوکہ دیتی رہی۔ کسی نہ کسی طرح گھر پہنچا۔ میری بیوی پڑوسن کو اس کے

گھر چھوڑ کر جب اپنے گھر میں داخل ہوئی تو مجھے دیکھ کر ہنسی کے مارے لوٹے جا رہی تھی۔

بارہ سال تک میں نے مالتی کو شکل کا چہرہ اور سانز کی کھنک کو ایک ساتھ رکھا تھا لیکن یہ خواب ٹوٹ گیا اور اب یہ حال ہے کہ :

جب سے تعبیر خواب الٹی ہے
کان اندھے ہیں آنکھ بہری ہے

زندگی کی بنیادی ضروریات میں اب کلب بھی داخل ہو گیا ہے۔ میرے ایک پڑوسی دوست نے ہزار پہلوؤں سے مجھے قائل کر کے کلب کا ممبر بنا دیا تھا۔ یہ بات بعد کو سمجھ میں آئی کہ روزانہ کلب آنے جانے کے لئے دراصل ان کو میری ضرورت نہیں بلکہ میری کار کی ضرورت تھی۔

زندگی میں پہلی مرتبہ کلب گیا تھا، سارے چہرے نئے تھے۔ پڑوسی صاحب نے میرا تعارف کرایا۔

"آپ سے ملئے، قاضی غیاث الدین، شاعر بھی ہیں۔ اور میرے پڑوسی بھی۔" پڑوسی کے لفظ پر سارے ہونٹ تبسم سے لبریز ہو گئے — ایک جلد باز بے تکلف دوست شمبھو داس نے آخر کہہ ہی دیا۔

"تو پھر آپ کو کلب آنے جانے میں سہولت تو مل گئی"۔ اس مختصر

تعارف کے بعد سب لوگ مختلف پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے — ایک برج کی
پارٹی، ایک رمی کی پارٹی، ایک پارٹی چس کھیلنے کو بیٹھ گئی — پہلے ہی دن
مجھے اکیلا دیکھ کر دو خواتین ازراہِ ہمدردی میرے قریب آ کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔
ایک محترمہ جو کم سے کم کپڑوں میں ملبوس تھیں، گرمی کی شکایت کرنے لگیں۔
وہ اپنے مختصر کپڑوں کا جواز ڈھونڈ رہی تھیں۔ دوسری محترمہ کے ہاتھ میں ایک
انگریزی ناول اور بڑی سی پرس کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ ان کا ادبی ذوق یقیناً
اونچا ہو گا۔

کم لباس محترمہ نے مجھ سے کہا: "مجھ سے گرمی برداشت نہیں ہوتی۔"
حالاں کہ اکثر لوگ یہاں گرم کپڑے پہن کر آئے ہیں۔
دوسری محترمہ جو چالیس کے لگ بھگ ہوں گی، مجھ سے کہا —
"دس سال قبل مجھے بھی گرمی کی برداشت نہیں تھی۔" پھر میری جانب
متوجہ ہو کر پوچھنے لگیں۔
"آپ اپنی مسز کو ساتھ کیوں نہیں لائے —؟" میں نے کہا وہ کئی
ماہ سے مسلسل بیمار ہیں — اتنے میں شمبھو داس جی بھی گفتگو میں شامل ہو
گئے۔ کہنے لگے۔
"کیا آپ کی مسز سخت علیل ہیں؟" میں نے مختصر جواب دیا۔
"ہاں" — وہ پھر پوچھنے لگے۔
"کیا بیماری سے بچ جانے کی امید ہے؟"
میں حیرت سے انھیں دیکھنے لگا۔ وہ سٹپٹائے۔ پھر کہنے لگے۔

وہ اصل میں کہنا کچھ اور چاہتا تھا، مگر منہ سے کچھ اور نکل گیا۔ آپ ہی دیکھئے! روزانہ کوئی نہ کوئی خوش خبری مجھ کو سننی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر۔ اس دوست کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ فلاں دوست کی بیوی بھاگ گئی۔ پڑوسی کی بیوی اس قدر سخت علیل ہے کہ بچنے کی قطعاً امید نہیں۔ ایک عزیز کی بیوی نے زہر کھا لیا۔ لیکن ہمارے لئے کوئی خوش خبری نہیں۔

میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا آپ ان تمام حادثات کو خوش خبری سمجھتے ہیں؟"

کہنے لگے۔ "پھر آپ کیا سمجھتے ہیں؟ کیا آپ نے گزشتہ بیس برسوں سے ایک ہی سوٹ پہن رکھا ہے؟ ایک ہی کار میں بیٹھتے آئے ہیں۔؟ آپ کے کمرے کا بلب جل جانے کے بعد آپ نے دوسرا بلب روشن نہیں کیا؟... بیڈ شیٹ آپ نے بیس سال سے نہیں بدلی؟۔

میں شمبھو داس جی کے بے سروپا باتوں سے بے حد پریشان تھا کہ کیا جواب دوں؟

کم لباس محترمہ نے کہا۔

"شمبھو داس جی! آپ کار، بلب، جوتا، بیڈ شیٹ، فاؤنٹن پین سے اپنی شریک حیات کا موازنہ کر رہے ہیں۔ اس طرح ہم خواتین بھی اپنے شوہروں کے تعلق سے سوچنا شروع کر دیں تو پھر آپ کہاں رہیں گے۔"

شمبھو داس جی مسکرائے۔

"بھابی، میرا کہنا بھی تو یہی ہے کہ سوچو، بالکل ایسا ہی سوچو۔ ایک

[illegible] چمک رہا ہے [illegible] رہی ہے ۔ پسینے میں شرابور ہے ۔ لیکن میرا سامنا ہوتے ہی اسپرنگ کی طرح اچک کر مسکراہٹ اس کے لبوں پر آجاتی ہے ۔ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ موسم کا ، بے حد مصروفیت کا ، یا کم از کم میری بے توجہی کا رونا روئے گی ۔ بھگوان کی قسم ایسا مسکراتی ہے کہ بس دل میں ایک دم بھالا اُتر جاتا ہے ۔"

اتنا کہہ کر شمبھو داس جی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ۔

"قاضی صاحب ، بھگوان کے لئے اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ سے مجھے نجات دلائیے ۔ ورنہ میں جی نہ سکوں گا ۔"

اور میں نے دیکھا کہ واقعی شمبھو داس جی کی آنکھیں بھیگ گئی ہیں اور وہ سسکیاں لے رہے ہیں ۔

میں وہاں سے اٹھ گیا ۔ جب دوسرے ہال میں گیا تو دونوں خواتین قریب آگئیں اور مجھ سے کہنے لگیں ۔

"شمبھو داس جی سے آپ کا مکمل تعارف ہو گیا نا" ؟

میں سراسیمہ تھا کہ بے چارے کو کس خانے میں فٹ کروں ۔ میں نے کہا — "یا تو بہت پی گئے ہیں یا پھر ان کے دماغ کے ایک دو اسکرو ڈھیلے ہیں ۔ وہ کہنے لگیں ۔

"نہیں قاضی صاحب موصوف روزانہ ہم سے یہی درخواست کرتے ہیں کہ اُن کو ان کی بیوی کی مسکراہٹ ، محبت اور شرافت سے نجات دلائیں ۔"

کم لباس محترمہ نے کہا ۔

"خیر مجھ سے تو انھوں نے صرف ایک ہی مرتبہ کہا ہے۔ اگر دوسری بار کہیں تو مجھے سوچنا پڑے گا۔"

اتنے میں میرے پڑوسی آ گئے

"بھئی، اب گھر چلتے ہیں۔ جیب میں جتنے پیسے تھے رمی کی نذر ہو گئے اور آپ نے کلب کی تفریح بھی کر لی ہو گی۔"

پھر دونوں خواتین سے بھی مخاطب ہوئے۔

"آئیے آپ دونوں بھی ہمارے ساتھ ہی چلئے، راستے میں آپ کو ڈراپ کر دیں گے۔"

غرض دونوں محترماؤں کو ان کے گھر اور پڑوسی کو ان کے گھر چھوڑ کر جملہ ایک لیٹر پٹرول خرچ کر کے میں گھر پہنچا تو میری بیوی میز پر میری منتظر تھی اور اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ مجھ سے تاخیر کی وجہ پوچھ رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا اس مسکراہٹ کو کوئی نام دے کر اس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کر سکتا ہے؟

لیکن جب کبھی کوئی شوربت ٹکراتی ہے تو مجھے سیٹھ شمبھو داس جی کے آنسو اور سسکیاں یاد آتی ہیں۔ وہ دن اور آج کا دن پھر کبھی کلب نہیں گیا۔

مس کلاوتی انصاری

کبھی جب وہ بے شکن پرشکوہ لباس پہن کر گھر سے نکلتی ہے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ کوئی ٹیچر ہیں جو کسی شادی کے لئے گرجا گھر جا رہی ہے۔ کبھی بلا آستین کا بلاؤز اور [illegible] کلر کی ساڑھی پہنے، جوڑا باندھے، جوڑے میں پھول لگائے گھر سے نکلتی ہے تو لگتا ہے ٹیک بنڈ پر کسی پریمی سے ملنے کو جا رہی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کہنیوں تک سفید کھدر کا بلاؤز اور سفید کھدر ہی کی ساڑھی پہنے بلکہ ساڑھی کا پلو سر پر ڈالے گھر سے نکلتی ہے تو... سیاسی یا سوشل ورکر معلوم ہوتی ہے۔

اسے کوئی مس کلاوتی کہتا ہے کوئی مس انصاری کہہ کر پکارتا ہے کوئی مس کلاوتی انصاری کے نام سے یاد کرتا ہے۔ مذہب اس کا اسی کو معلوم، کسی مسجد، مندر یا گرجا میں بھی نظر نہیں آتی۔

اردو نہایت شستہ اور انگریزی کا تلفظ اور روانی حیرت انگیز، ہندی
اور تلگو بھی اتنا جانتی ہے کہ لکھ پڑھ لینے کے علاوہ بول لیتی اور سمجھ لیتی ہے۔
اس کے دوستوں میں بوڑھے، جوان، بچے، مرد اور عورتیں سبھی ہیں۔ پڑھے
لکھے دانشور بھی اور اجڈ جاہل گنوار بھی۔ عمر ہوگی پچیس تیس کے لگ بھگ
قد متوسط و متناسب، بھرا بھرا جسم، سرخ و سفید رنگ ہر وقت سجی
سجائی، اس کا گھر دو کمروں پر مشتمل ہے۔ ایک انتظار گاہ، دوسرا اس کا
نجی کمرہ۔ انتظار گاہ میں ہر قسم کا مرد اور ہر قسم کی عورت۔ وہ سجی سجائی
اپنے پرائیویٹ روم سے نکلتی ہے اور ہر فرد سے احوال سنتی جاتی ہے اور
اپنی موٹی سی ڈائری میں نوٹ کرتی جاتی ہے۔ دلاسے دیتی ہے، یقین دلاتی
ہے۔ "میں آج ہی منسٹر صاحب سے ملوں گی اور آپ کا کام ہو جائے گا۔
میں نے ناظم صاحب سے کہہ دیا ہے انھوں نے وعدہ کر لیا ہے، ملازمت
آپ کو مل جائے گی۔"

اس کا گھر میرے گھر کے روبرو تھا۔ میں علی الصبح اخبار لے کر اپنے
ڈرائینگ روم میں آ بیٹھتا لیکن جب اندر سے ناشتے کا بلاوا آتا تو اخبار
لے کر اندر جاتا۔ ناشتے کے بعد اخبار میری بیوی کی ملکیت بن جاتا ہے۔
وہ پڑھنا شروع کر دیتی ہے اور ایران، افغانستان کی سیاست سے
لے کر کامن ویلتھ تک پہنچ جاتی ہے اور تازہ خبروں پر مجھ سے بحث
کرنا چاہتی ہے۔ جب میں جواب۔۔ نہیں دے پاتا ہوں تو وہ کہنا شروع
کر دیتی ... صبح آپ نے اخبار پڑھا کب ہے؛ سامنے والی آنٹی مس چند؟

"اولمپورٹنٹ ہوں گے۔"

میری بیوی اس بے چاری کو "مس چندہ" اس لئے کہتی تھی کہ وہ سال میں تین چار مرتبہ غریبوں کی مدد کے لئے چندہ مانگنے آیا کرتی تھی۔ میری بیوی تو دس روپلے سے کبھی آگے نہ بڑھی لیکن میں آنکھ بچا کر اسے دیوان خانے میں پچیس پچاس تھما دیتا اور رسید نہ لیتا تھا۔ میں اس کے سوشیل ورک کی تعریف کرتا اور میری بیوی میری مخالفت کرتی تھی۔ بیوی کا خیال تھا کہ وہ چندوں کی ساری رقم اپنے لباس اور بناؤ سنگھار پر خرچ کرلیتی ہے۔

میری بیوی کو بڑی فکر تھی کہ وہ کیسے پکاتی ہوگی؟ کیا پکاتی ہوگی؟ اس کا خاندان کیا ہے؟ اس کا مذہب کیا ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ کہاں جانے والی ہے؟ میں کہتا۔ "دس برسوں سے تو سامنے ہے، کبھی اس کی کوئی بُری حرکت کسی نے دیکھی ہے؟" ۔اس پر میری بیوی چراغ پا ہوجاتی۔ "جی ہاں (ایسی ہی محترمائیں چھپ چھپ کر سب کچھ کرتی ہیں۔ آخر اس نے شادی کیوں نہیں کی۔"؟ میں کہتا۔ "میں کسی روز اس سے پوچھ کر بتادوں گا"؟ میری بیوی بھڑک جاتی۔ "خدا کی قسم جو آپ اس کے گھر گئے۔ پھر میرے گھر نہ آنا۔" میں ہنس دیتا۔

مس ستارہ جبیں انصاری سے اگر کوئی پوچھتا۔ "آپ کا مذہب کیا ہے؟" تو وہ بڑے فخر سے جواب دیتی۔ "انسانیت"۔ وطن؟ تو وہ کہتی "دھرتی کا ہر خطہ میرا وطن ہے۔ خاندان؟ تو کہتی "میں آدمی کی اولاد ہوں"۔ رشتے دار

عزیز و اقارب و لوٹ گئی۔ "دنیا کا ہر مظلوم، مفلس، غریب اور
کمزور میرا رشتہ دار، عزیز اور دوست ہے۔ ان کی خدمت کر کے میں خدا
کو، بھگوان کو پہچانتی ہوں۔"

ایک دن میں ایک لائبریری میں کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ وہ میرے
قریب آکر بیٹھ گئی۔ سلام و دعا کے بعد اس نے جیب سے ایک کاغذ نکالا
اس پر ایک مصرعہ لکھا تھا اور تاریخ درج تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے
اسے دیکھا۔ وہ بول اٹھی۔ "مجھے اس طرح میں سات شعر کی ایک غزل
چاہیئے۔ اس تاریخ سے پہلے بلکہ آج ہی کے دن اسی جگہ۔" میں نے وعدہ
کر لیا۔ ایک ہفتہ گذر گیا۔ میں لائبریری کچھ تاخیر سے پہنچا۔ وہ موجود تھی
کہنے لگی: "میں تخلص لکھنا بھول گئی تھی۔ تخلص حنا ہے۔"

میں نے مقطع اسی وقت کہا اور کاغذ اسے دے دیا۔ وہ معذرت
کرنے لگی۔ "میں اس کے معاوضے میں آپ کی خدمت کبھی کر دیا کروں گی۔"
میں نے کہا۔ قطعاً نہیں۔ ایسا آپ کبھی نہیں کریں گی۔" وہ مسکرائی۔ گویا
موگرا اور چنبیلی کے پھول برس گئے۔ وہ چلی گئی۔ اب میں لائبریری کو باقاعدہ
آنے لگا تھا۔ وہ برابر ملتی، کبھی غزل، کبھی نظم اور کبھی مضمون کی فرمائش
کرتی۔ حیرت تو مجھے اس بات پر تھی کہ وہ مقطعوں میں ہمیشہ نئے نئے
تخلص لکھواتی۔

ایک روز ہم معمول کے مطابق بیٹھے تھے۔ لائبریری میں ایک دو
اصحاب کے سوا کوئی نہ تھا۔ میں نے دل کڑا کر کے اس سے پوچھ ہی لیا کہ

یہ مضمون نگار خواتین اور شاعرات کون ہیں تو وہ بہت آزردہ ہوگئی... کہنے لگی، کچھ بھوک پیاس کی ماری عورتیں ہیں۔ معمولی پڑھی لکھی۔ میری ایک دوست ایک ادبی جریدہ نکالتی ہے میں یہ سب کچھ اس کو سونپ کر روپیے حاصل کرتی ہوں اور آپ کی شاگرد (یعنی میں) کی شاگرد خواتین میں یہ روپیے تقسیم کر دیتی ہوں"۔ وہ آب دیدہ ہوگئی تھی۔ بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

"میں صرف ان خواتین کی خدمت کرتی ہوں جو اپنے شوہروں کے ظلم سے تنگ آگئی ہیں یا پھر بلا امتیاز جنس ان لوگوں کی خدمت کرتی ہوں، جن کے ماں باپ نہیں ہوتے یا وہ لوگ جو اپنے ماں باپ کو نہیں جانتے۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "شہر کی ایک مشہور ہوٹل کے مالک کی بیوی ہوں"۔ بی، اے ہوں، سیون پکوان میں ڈپلوما ہے میرے پاس، لیکن میں نہیں جانتی کہ میرے ماں باپ کون ہیں۔ کس نے مجھے جنم دیا ہے۔ یتیم خانے کی شفیق ہیڈ مسٹرس نے میری شادی ایک لکھ پتی سے کروا دی۔ جب مجھ سے اس کا جی بھر گیا تو میرے ماں باپ کا نام پوچھنا شروع کیا۔ پہلے بے التفاتی، پھر ظلم پر اتر آیا۔ میں نے اس کا گھر چھوڑ دیا ہے۔ ٹیوشن کر کے زندگی گذار لیتی ہوں، بن ماں باپ کے انسانوں کی اور مظلوم بیویوں کی خدمت کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی ہوں۔ ہر ظالم ایک نہ ایک دن سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔ میں صرف ظالموں کی گردنوں میں سولی کا پھندا دیکھنے کو زندہ ہوں۔ میری یہی ایک آرزو ہے، ورنہ میری زندگی

"مجھے ہنسی آتی ہے جب کوئی کہتا ہے، یہ ہندو ہے یہ مسلمان ہے، یہ عیسائی ہے پارسی ہے۔ حالانکہ انسانوں کی صرف دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک ظالم اور لوٹنے والا۔ دوسرا مظلوم اور لٹنے والا۔ جب تک سارے مظلوم متحد نہ ہو جائیں۔ دنیا سے ظلم نہیں اٹھ سکتا اور جب یہ ظالم جاتی دنیا سے ختم ہو جائیں تو انسانوں کی صرف ایک ہی قسم رہ جائے گی۔ معصوم شریف اور طاقتور انسان۔"

میرا صحیح نام آپ کو نہیں معلوم، میں نے خود اپنا نام کلاوتی انصاری رکھ لیا ہے۔ کیونکہ مجھے کلا بہت پسند ہے اور انصاری اس لئے کہ جب وطن کی زمین تنگ ہو جاتی ہے تو مظلوم ہجرت کر کے قافلہ قافلہ میرے پاس آتے ہیں تو میں ان مہاجرین کے لئے انصار بن جاتی ہوں۔ اپنی عصمت و عزت کو چھوڑ کر ان کی خدمت میں ہر چیز پیش کر کے سکون حاصل کرتی ہوں"

یہ تقریر اس کے منہ سے سننے کے بعد مجھے یہ نازک حسینہ فولاد کا پیکر لگ رہی تھی۔ واقعی انسان بھی تضادوں کا ایک شہر ہوتا ہے۔

جہاں استاد

چالیس برس کی مشقِ سخن اور ساٹھ سال کے سن نے جہاں استاد کو گرگِ جہاں دیدہ بنا دیا تھا۔ پہلی بیوی کی عمر پچپن سال تھی اور یار دوستوں نے ایک مال دار تاجر کو پہلے جہاں استاد کا شاگرد بنایا بعد کو جہاں استاد نے اس تاجر کی بیس سالہ لڑکی لعل بی کو اپنی چوتھی بیوی بن جانے کا شرف بخشا۔ جہیز میں نیا ڈبل بڈ، نیا فین، نیا صوفہ سیٹ، غرض ہر چیز نئی ملی تو پرانی بیوی نے نہا کر نماز پڑھی اور کھلے بالوں سے دعا مانگی:

"لعل بی میری طرح بچوں کی نانی ہو جائے
اس کی جو چیز نئی ہے وہ پرانی ہو جائے"

جہاں استاد بیویاں تلاش کرنے میں بڑے ماہر ہیں۔ عمر، خاندان پیشہ، تعلیم، کسی بات کی قید نہیں۔ شرط صرف اتنی ہے کہ بیوی مفید ہو۔

[illegible]
سے ٹھنی ہوئی لڑائی ہے۔ جب کسی سے مقدمے کی نوبت آجائے تو
جہاں استاد کے خسر صاحب گون شانوں پر ڈالے، گلے میں پٹہ لٹکائے
جہاں استاد کی وکالت کو موجود ہوتے ہیں۔

دوسری بیوی پولیس آفیسر کی بیٹی ہے۔ سارے شہر پر جہاں استاد
کی کوتوالی چلتی ہے۔ کسی شاگرد نے "معمول" نہ پہنچایا تو پولیس والا اس کو
پکڑ کر جہاں استاد کی خدمت میں پیش کر دیتا ہے۔ یا پھر کسی حریف یا ہم عصر
شاعر کی درگت بنانی ہو تو جہاں استاد کے خسر صاحب کوتوالی کا ڈنڈا
اٹھا لیتے ہیں۔ شہر کے سارے غنڈے جہاں استاد کو جھک جھک کر
سلام کرتے ہیں۔ اور جہاں استاد گینڈے کی طرح صرف گردن ہلا کر
ان کے سلام کا جواب دیتے ہیں۔

جہاں استاد کی تیسری بیوی ہسپتال میں نرس ہے۔ پلنگ کی
سفید چادریں، پھولدان، تکیوں کے غلاف، دودھ، برڈ ٹانک کی بوتلیں،
وٹامن کی گولیاں اور تازہ میوے، دن میں دو مرتبہ دواخانے سے آجاتے ہیں
پہلی تاریخ کو چار سو روپے کے کرکراتے نوٹ جب نرس بیوی جہاں
استاد کے ہاتھ پر رکھ کر مسکرا دیتی ہے تو جہاں استاد سر مغرب ہی چراغ
گل کر کے اندھیرے میں اس کی پرخلوص مسکراہٹ کو اپنے ہونٹوں پر
تولتے رہتے ہیں۔

[illegible]

سب پھیکے پڑ گئے ہیں تبسم کے سامنے

جہاں استاد کی چوتھی بیوی ایک تاجر کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اس نے
مال و زر سے جہاں استاد کا گھر بھر دیا ہے۔
جہاں استاد نے شہر کے نامور ڈاکٹروں سے مشورہ بھی کر لیا ہے کہ
ان کے محترم خسر ابھی کئی سال زندہ رہ سکتے ہیں، کیونکہ خسر کے بعد ساری
جائیداد کی وارث ان کی چوتھی بیوی ہی تو ہوگی۔ جہاں استاد کے چاروں
خسر شاعر ہیں اور جہاں استاد چاروں کے لئے شعر کہتے ہیں۔
ان کے علاوہ شہر کے امیر زادے تو دو لیتے بھی، جہاں استاد سے
شعر خریدتے ہیں۔ فی غزل، فی شعر، فی ترکیب، فی صنعت مقرر کردہ
قیمت ادا کرتے ہیں، اور شعر لے جاتے ہیں۔ چونکہ معقول قیمت ادا کرتے
ہیں اس لئے کسوٹی لگا کر، کاٹ کر، چھیل کر، پرکھ کر، چکھ کر، سونگھ کر شعر
خریدتے ہیں۔ خریداروں میں خواتین بھی شامل ہیں۔ جوان سے لے کر بوڑھی
تک، ان پڑھ سے لے کر گریجویٹ تک۔ سب کی سب جہاں استاد کو
حسب استطاعت نہ صرف روپے پیسے دیتی ہیں بلکہ اناج، کپڑا، زیور
تک، سب کچھ نذر کر دیتی ہیں، اور یہ جہاں استاد کی وفادار ایجنٹ بھی
ہوتی ہیں۔ آل انڈیا مشاعرہ ہو تو جہاں استاد ان کے ذریعے [illegible]
مشاعرہ تک اپنے لئے سفارشیں پہنچاتے ہیں اور بڑے ٹھاٹھ سے مشاعرہ
لوٹتے ہیں۔ جس شب مشاعرہ ہو اسی دن علی الصبح جہاں استاد کا دربار

ہوتا ہے۔ ادھر ... شاگردوں کو مختلف رنگوں کی پٹیوں پر مختلف روشنائیوں سے لکھی ہوئی فرمائشیں دی جاتی ہیں جن میں جہاں استاد سے دوبارہ کلام سنانے پر اصرار کیا جاتا ہے اور یہ چٹھیاں وقفے وقفے سے منتظم مشاعرہ تک پہنچائی جاتی ہے۔ یہ چٹھیاں ہر درجے سے ہر سمت سے چھوٹے چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کے ذریعے پہنچائی جاتی ہیں۔ صدر مشاعرہ یا منتظم مشاعرہ مجبور ہو جاتے ہیں اور جہاں استاد کے نام کا اعلان کر دیتے ہیں اور تالیوں سے میدان گونج اٹھتا ہے، ادھر جہاں استاد نے پہلا مصرعہ پڑھا تو شاگردوں نے اٹھایا۔ دوسرا مصرعہ تو پ [illegible] کے سروں پر پڑتا ہے تعریفوں سے چھت پھٹ جاتی ہے۔

جہاں استاد کے شاگرد اضلاع میں بھی موجود ہیں۔ ہر مشاعرے میں جہاں استاد کو بلانا ان کا ایمان ہوتا ہے۔ معاوضہ بڑھانا۔ جہاں استاد کی قدر و منزلت میں اضافہ کرنا ان کا دھرم ہوتا ہے۔ جہاں استاد کے شاگردوں میں قصاب، حجام، دھوبی اور موچی بھی شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ جہاں استاد کے گھر کے سارے کام کاج آخر کون کرے؟

جہاں استاد کے اضلاع کے شاگردوں کا کام ہے کہ بڑے عہدیداروں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے اربابِ مقتدر کو جہاں استاد کی شاعری کی تعریف میں ہر ہفتہ خطوط لکھا کریں، اور مقامی اخباروں کے علاوہ شہر کے بڑے اخباروں کے ایڈیٹروں کو توصیفی خطوط لکھا کریں۔ ملک کے مشہور اور نامور ہندوستانیوں کے ایڈیٹروں کے نام خطوط کے کالم میں جہاں استاد کے کسی

شعر کو موضوعِ بحث بنائیں اور قلم کا زور تائید و توصیف میں زیادہ، اور تنقیص میں کم، دکھائیں۔ ان مہمات کے علاوہ ایک اہم کام جہاں استاد کے شاگرد انجام دیتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ شہر کے خنجر بکف نقادوں کو ہر ہفتہ دعوتِ طعام دیتے ہیں۔ کہیں یہ خنجر میر و غالب سے ہوتا ہوا جہاں استاد کی شاعری کے سینے میں پیوست نہ ہو جائے۔

یہ بات قابلِ تعریف ہے کہ جہاں استاد کے جملہ شاگرد ایک دوسرے سے واقف ہیں۔ راستے میں جب ملاقات ہو جائے تو مکوڑوں کی طرح گلے ملے بغیر یا معانقہ کیے بغیر آگے نہیں بڑھتے۔ آپس میں اتحاد ہے اور سب کا مقصدِ زندگی ہندوستان کی آبادی میں شاعروں کی تعداد بڑھانا ہے۔ ان کا نظریۂ حیات یہ ہے کہ اگر ہندوستان کا بچہ بچہ شاعر ہو جائے تو آئے دن کے فسادات ختم ہو جائیں گے، فکر زیادہ کریں گے، کھانا کم کھائیں گے اور تخیلات کی جنت میں مست رہیں گے۔ سیاسی جماعتوں کی ہڑبونگ، اجتماعی مظاہرے اور ہڑتالیں ختم ہو جائیں گی۔ پارلیمنٹ کے ممبر ایک دوسرے کو غزلیں سنا سنا کر خوب داد حاصل کریں گے۔ اور ہندوستان حقیقت میں جنت نشان بن جائے گا۔

جہاں استاد کے شاگردوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو زمین کا پیوند آسمان کو اور آسمان کا پیوند زمین کو لگا دیتے ہیں۔ یہ لوگ دولت مندوں کی لڑکیوں کو محلے کے غریب لڑکوں کے ساتھ بھگا دیتے ہیں اور غریب

لڑکیوں کو دولت مندوں کے گھروں کی زینت بنا دیتے ہیں۔ شادی مشاعرے میں بدل جاتی ہے اور ایسا ایسے سہرے پڑھے جاتے ہیں کہ غالب و ذوق اپنے اپنے دیوانوں میں منہ چھپائے پڑے رہتے ہیں۔

ناگوار و ناگزیر

بچے کو تیز بخار ہے. کڑوی گولی ڈاکٹر نے تجویز کی ہے، بچے نے گولی کھا
سے انکار کر دیا ہے. ماں باپ، بچے کے دونوں ہاتھ پاؤں قابو میں کر
سے منہ کھول کر حلق میں ڈال دیتے ہیں اور دو گھونٹ پانی بھی. اس
کھلا کر ماں باپ اپنا ناگوار و ناگزیر فرض ادا کرتے ہیں.

بالکل اسی طرح زندگی کے مختلف شعبوں میں (ایک حق پسند اور فرض
انسان کو بھی مختلف حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس کے حل کے طور پر
ایک ناگوار و ناگزیر فرض ادا کرنا پڑتا ہے.

ایسا ہی ایک واقعہ میرے ساتھ پیش آیا. ایک اخبار کے جوائنٹ
ایڈیٹر نے اپنے ملازم کے ذریعہ مجھ سے خواہش کی کہ میں دس بار گیارہ بجے دن
کے بعد میاں ان کے دفتر آؤں. میں دفتر گیا. انھوں نے میرے ہاتھ میں تو تشفولیں

کا ایک نقطہ لگا دیا۔ "اس کی اہمیت اور حیثیت کے بارے میں آپ کی رائے کی ضرورت ہے۔" میں نے اپنی رائے تحریر کر دی، اس کے بعد موصوف نے فرمایا: فلاں میموریل مشاعرے میں ابتدا سے شرکت کرتے آ رہے ہیں۔ اس مرتبہ آپ کا نام ہم نے اس مشاعرے کی فہرست سے نکال دیا ہے۔ اور فلاں ٹرسٹ کے مشاعرے میں آپ کو مدعو کیا ہے۔" میں نے کہا "مناسب ہے۔"...
حالاں کہ دوسرے چند شعرا برسہا برس سے اس مشاعرے میں مسلسل پڑھتے رہے ہیں، ان کی عدم شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ وہ شعرا ان کے دفتر کے چکر لگاتے رہتے ہیں، اور وہ ان کے درباری ہیں ۔ بہرحال بات آئی گئی ہو گئی۔ فلاں میموریل مشاعرے میں مجھے پڑھنا تو تھا ہی نہیں لیکن توقع تھی کہ بحد سماعت مجھے مدعو کیا جائے گا۔ وہ بھی نہیں ہوا۔ فلاں ٹرسٹ کا مشاعرہ بھی دھوم سے آیا اور گزر گیا لیکن کسی مصلحت کی بنا پر مجھے مدعو نہیں کیا گیا۔
میں نے ان کے وعدے کو نظر انداز کر دیا۔

مشاعرے کے دوسرے دن ہی میرے گھر سے قریب اردو کا ایک فنکشن تھا، خیمہ نصب کیا گیا تھا۔ میں پہلی صف میں بیٹھا تھا۔ میری بائیں جانب ایک وزیر صاحب آکر بیٹھ گئے ہیں۔ اور دائیں جانب اسی اخبار کے ایڈیٹر صاحب براجمان تھے۔ وزیر صاحب نے مجھ سے دریافت فرمایا،
"کل مشاعرے میں آپ کیوں نہیں آئے۔" میں نے وزیر موصوف سے (دائیں جانب بیٹھے ایڈیٹر صاحب کی طرف اشارہ کر کے) کہا کہ ان سے

ہو جائے۔ اس پر ایڈیٹر صاحب ذرا جھینپ گئے۔ اور بولے کہ ؟ ذرا ٹھہرو،
ذرا مشاعرے سے دو ایک روز پیشتر ہمارے دفتر کو آجاتے تو کیا تھا۔"
ہوگئی نا شاعروں، ادیبوں، دانشوروں کی غیرت کی ایسی تیسی!

میں نے اس روز سے ان کے دفتر کو جانا ترک کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ اُردو کے ہر مسئلے پر اپنی بالادستی قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ ایڈیٹر موصوف سے کم از کم تیس پینتیس سال کی دوستی ہے، دور کی قرابت بھی، سماجی، صحافتی، ادبی رشتے بھی۔ اُن کے احسانات مجھ پر اور میرا اہم تعاون اُن کے ساتھ۔ اسی طرح ربع صدی گزر گئی۔ میں نے بقدر امکان ظرف واستطاعت، اُن کی نام آوری، ان کے اخبار کی ترویج واشاعت میں اپنا فرض بھی ادا کیا ہے۔ لیکن یہاں بات آپڑی تھی عزتِ نفس کی۔ میں یا مجھ جیسے اور ادیب وشاعر بھی، مشاعروں میں شرکت یا اخباری شہرت پر، عزتِ نفس کو ہرگز قربان نہیں کر سکتے۔ شریف خاندان کے دو افراد صرف اس وجہ سے ایک دوسرے سے دور ہو گئے ہیں کہ ایک نہ صرف اپنی بلکہ سارے ادیبوں اور شاعروں کی عزتِ نفس کی حفاظت کر رہا ہے اور دوسرا شخص عزتِ نفس کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لئے تیغ انانیت عَلم کئے ہوئے ہے زر، زن، زمین کا جھگڑا نہیں۔ ایک دوسرے کے دشمن نہیں۔ لیکن خلیج حائل ہوگئی ہے۔ اس خلیج کی تعمیر میں کتنے انجینیروں نے کام کیا ہے، وہ خدا کو معلوم ہے۔ میں نے اُن کے دفتر جانا چھوڑ دیا ہے۔ ایسا کرنا کچھ اچھا نہیں لگتا لیکن ایک ناگوار و ناگزیر فرض جان کر ادا کر رہا ہوں۔

ایک محترمہ میرے مطب آتی ہیں۔ مالدار، حسین اور تعلیم یافتہ ہیں جھاڑ
کی فیس بقدر ادا کرتی ہیں۔ اُن کو اختلاج قلب اور ہائی بلڈ پریشر کے عارضے ہیں
محترمہ ایک مقدس خاندان سے راست تعلق رکھتی ہیں۔ میں مریضوں سے تعلقات
کو وسعت دینے کے لئے ہرگز تیار نہیں لیکن محترمہ کبھی نہ کبھی بہانے اپنے افرادِ خاندان
بیٹا بیٹی کو نہ صرف اپنے ہمراہ لاتی ہیں، بلکہ ان کا مکمل اور مفصل تعارف بھی کراتی ہیں
مقصد صاف ہے۔ میرے بچوں سے رشتے کی آرزومند ہیں، لیکن اُن سے رشتہ
مجھے قطعی پسند نہیں کیونکہ محترمہ اور ان کی صاحبزادی کے مختصر ترین لباس میرے
دل میں گھر نہیں کرسکتے، ان کے صاحبزادے فلمی ہیرو سے کم نہیں۔ وہ ڈاکٹر ہوں یا
انجنیئر مجھے اُن کی تقلیدی روش قطعی پسند نہیں۔ میرا مسلک یہ ہے کہ لوگ ہماری
قدر کریں ۔

ایسے ملا کرو کہ کریں لوگ آرزو
ایسے رہا کرو کہ زمانہ مثال دے

میں ذرا چھچھورا قسم کا آدمی ہوں۔ اور محترمہ میری اس کمزوری سے بخوبی واقف
ہیں۔ میری پسندیدہ ڈشیں اور مربے وغیرہ لاتی ہیں۔ میں مسکرا کر قبول کرلیتا ہوں
البتہ ان کے مختصر لباس اور ان کے بچوں کی فلمی چال پر دبی زبان میں تنقید بھی
کر دیا کرتا ہوں۔ وہ مسکرا کر ہاں میں ہاں ملا دیتی ہیں۔ اُن کے تائیدی جملے صرف
ان کی لب آشنا سے [illegible]
میں بھی تنقید کا ناگوار مگر ناگزیر فرض ادا کر کے خاموش ہو جاتا ہوں۔

دیکھنے کا موقع میسر آتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مولانا، مفت میں کیوں میرے پانچ ہزار کھلوا رہے ہیں آپ"۔ مولانا بگڑ گئے۔ ادھر بیوی بچوں نے تائید شروع کی۔ آخر کو سازش کامیاب ہوئی، اور ٹی وی گھر آیا۔

بچی کی شادی میں نذر کی جانے والی جوڑے کی رقم ٹی وی پر خرچ ہو گئی؟ آزادی کے تین دہوں نے بھی جوڑے کی رقم اور جہیز کی فہرست کا کیا بگاڑ لیا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک صاحب ایم، اے ہیں لیکن ان کی لنگائی بجھائی اور تعلیم نے ان کا کیا بگاڑ لیا۔ بہر حال جوڑے کی سازش کی مہم جاری ہے۔ رقم اور جہیز۔ قرض کی طرح ادا کیے جاتے ہیں۔ البتہ مہر کی رقم نے مذہب کی پناہ حاصل کر لی ہے اور مختصر سے مختصر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ مہر باندھتے وقت اور طلاق دیتے وقت مذہب ہمارے سر چڑھ کر بولتا ہے۔ بچی کی شادی کو مبہم کر کے دنیا سے آگاہی کا آفتاب ٹی وی کی شکل میں ہمارے گھر طلوع ہو گیا ہے۔ رہنماؤں کی تصویروں سے اور پکچروں کے نور سے ہمارا گھر منور ہو گیا ہے۔ ٹی وی گھر آیا تو بیوی نے اپنے عزیزوں، اقارب خواتین اور بچیوں نے اپنی دوست لڑکیوں کو خط لکھ کر فون پر فون کر کے اطلاع دی۔ اب کیا تھا۔ فلم جس روز دکھائی جاتی اس دن [illegible] سے آمد آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ چائے بسکٹ کا انتظام اور [illegible] بعد عشائیے کا اہتمام ہوتا۔ الیکٹریسٹی کی بل اور [illegible] کا بجٹ [illegible] اس قدر بڑھا کہ میری بیوی کو میرے ایک دوست سے [illegible] کو آنا بھی ناگوار تھا۔ بیوی بچوں کی دس

بہرحال خواتین کے معاوضے میں میری ایک دوست خاتون کو (جو ٹکوریاں بہت اچھی بناتی ہیں) [illegible] آنکا اور پکچر دیکھنے کا موقع مل گیا۔ میں نے یہ بھی غنیمت جانا وہ خالی ہاتھ تھوڑی آتی تھی۔ میرے پسندیدہ سموسے اور میری مرغوب ٹکوریاں بنا کر لاتی تھی اور چھپا کر اندھیرے میں مجھے دے دیتی تھی۔ میں اس سے آگے کبھی نہیں بڑھا کیونکہ مولانا کا پند و نصائح کا سمندر سامنے تھا جس میں اتر رہا تھا اور میں وہ پار نہ کر سکتا تھا۔ مولانا بھی نظر بچا کر ایک آدھ ٹکوری منہ میں ڈال لیتے اور بعد پکچر کی تعریف میں "سبحان اللہ" کا نعرہ بلند کرتے

میرے گھر سے سو گز کے فاصلے پر ایک خود ساختہ لیڈر کا مکان تھا۔ اُن کے مکان کی چھت پر Antena نصب ہو گیا تھا۔ میں نے لیڈر صاحب سے دریافت کیا "آپ نے بھی ٹی وی خرید لیا ہے۔ مبارک" کہنے لگے "نہیں جناب میں نے اپنے پڑوسی کی لڑکی کا بیاہ ایک اہم لیڈر کے لڑکے سے طے کروایا، تو انہوں نے ازراہِ ہمسایہ نوازی یہ Antena نصب کر دیا ہے۔ جس دن چاہوں گا دوست احباب کو پکچر دیکھنے کے لئے مدعو کر لوں گا۔ اور آپ کے گھر سے ٹی وی منگوا لوں گا۔ بھلا آپ سے کیا تکلف ہے مجھے" میں نے صبر کیا اور کہا "ضرور ضرور" ٹی وی نہ صرف ایک گھر میں پکچر دکھاتا ہے بلکہ [illegible] بنا پھرتا بھی ہے۔ ٹی وی تو جنتا خریدتی ہے۔ لیڈر صرف Antena نصب کروا لیتا ہے۔

ہفتہ میں ایک مرتبہ مولانا اپنی بیوی کے ساتھ تشریف لاتے تھے۔ [illegible]

کی شخصیت اور اثر کی وجہ سے ساری خواتین اُن سے پردہ نہیں کرتیں، مولانا کی
بیوی لیے چاری تسبیح پھیرتی جاتی ہے اور پکچر دیکھتی جاتی ہے۔ درمیان میں کہیں
کہیں مولانا کا وعظ شروع ہوجاتا ہے۔ دیگر خواتین ناک بھوں چڑھاتی ہیں۔
بجز بتہ ہوتی ہیں۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ مجھے کچھ اچھا معلوم ہوتا ہے کچھ نامناسب
معلوم ہوتا ہے۔ لیکن خاموش ہوجاتا ہوں، اور میری یہ خاموشی ناگوار بھی ہے
اور ناگزیر ہے۔

ممتاز شخصیتوں

کے

تأثرات

اُس نے چاہا تھا کہانی لکھ کے ہو جائے امر
خود کہانی بن گیا، تحریر تک سوجھی نہیں

غیاث صدیقی

محترمہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صاحبہ

ڈاکٹر غیاث صدیقی صاحب کی "باغ وبہار" شخصیت سے میں عرصے سے واقف ہوں۔ اُن کی بیگم میری عزیزہ شاگرد رہ چکی ہیں میرے خیال میں نہ صرف حیدرآباد بلکہ دکن اور شمالی ہند میں بھی غیاث صدیقی صاحب نے اپنی شاعری اور ادب نوازی کا سکہ جمایا ہے۔ اور تقریباً تمام سربرآوردہ ادبی شخصیتوں سے ان کی رسم وراہ ہے۔ نہ صرف اچھے شاعر اور نثر نگار ہیں بلکہ اچھے نقاد بھی ہیں۔ بالخصوص شاعری کے قدیم دبستان کے رموز ونکات کے ساتھ جدید دبستان کی بوقلمونیوں کا بھی انھیں خوب اندازہ ہے۔ اُن کی شاعری غم حیات اور تجربات کا ترجمان ہے۔ اور ان کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے۔ اُن کے کئی مجموعے اردو کے ادبا، شعرا اور نقادوں سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

میری دعا ہے کہ اُن کی فکر تازہ اور قلم جواں رہے۔ تاکہ اردو دنیا ایک تازہ کار ذہن کی تخلیقات سے لطف اندوز ہوتی رہے، — اور

کہ ونگادبہ د کے بعد بھی انشائیوں کے کئی مجموعے ہمارے ہاتھوں میں ہوں۔

غیاث صدیقی صاحب کے تعلق سے اور کیا لکھوں۔ صرف اُن کی شخصیت کی ترجمانی کے لئے داغ کا یہ شعر کافی ہے ؎

خوش بہت ہوں گے جب ملیں گے آپ
داغ ایک آدمی ہے گرما گرم!

رفیعہ سلطانہ
ڈین فیکلٹی آف آرٹس جامعہ عثمانیہ

۱۹۸۳ء

جناب مجاہد علی عباسی صاحب

ڈاکٹر غیاث صدیقی صاحب سے میں عرصے سے واقف ہوں۔
اُن کے اچھے کاموں سے بھی اور شاعری اور مضمون نگاری سے بھی جب میں
نظامس ٹرسٹ کا معتمد تھا، اُن سے اکثر ٹرسٹ کے مسائل پر گفتگو ہوتی
تھی۔ اہل خاندان کے تعلق سے اُن کے دردِ دل کا اندازہ ہوتا تھا۔ چنانچہ
اُن کے مشورے سے کئی اچھے کام صاحبزادگان (افراد خاندان نظام حیدرآباد)
کے لئے انجام پائے۔ معاملہ فہم ہیں اور گفتگو میں سلیقہ ہے، جو اکثر شاعروں اور
ادیبوں میں کم پایا جاتا ہے۔

اُن کی شاعری کے متعدد مجموعے زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر اہل علم
نقد سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں، جن میں بعض نوجوانی کے اہل قلم شامل ہیں
شاعری کا بہت ہی نکھرا ذوق رکھتے ہیں۔ اور دوسروں کے اچھے بُرے شعر
میں امتیاز کی صلاحیت بدرجۂ اتم رکھتے ہیں۔
نثر نگاری کے میدان میں بھی بھلی قدم رکھتے ہیں اور نہایت دلچسپ

اور شگفتہ انداز میں کردار و حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔

میں نے اُن کا مجموعہ مضامین "گونگا درد" تفصیل سے دیکھا ہے۔ یہ انشائیوں اور مزاحیہ مضامین پر مشتمل ہے۔ انھیں پڑھ کر اکثر پُرانے ممتاز مزاح نگاروں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ بالخصوص "سالی" اور "شاعروں کا قبرستان" میں جس انداز سے انھوں نے نقشہ کشی کی ہے۔ وہ بے حد عجیب اور قابلِ تحسین ہے۔

محامد علی عبّاسی

۱۹۸۳ء

ڈاکٹر یوسف سرمست صاحب

غیاث صدیقی صاحب سے دنوں سے واقف ہوں۔ ان کے نام اور کام سے سبھی واقف ہیں۔ لیکن جو لوگ اُن کو قریب سے دیکھ سکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس نام اور کام کے پیچھے ایک وضع دار اور شریف انسان بڑی خاموشی اور لگن کے ساتھ شعر و ادب کی خدمت کرنے میں مصروف ہے۔ مجھے بھی غیاث صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اُن کی مہمان نوازی اور وضع داری سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

غیاث صاحب ایک اچھے شاعر ہیں اور اس کے ساتھ ایک اچھے مترجم بھی ہیں۔ شاعری کا ترجمہ سب سے مشکل کام ہے لیکن وہ اُس سے بھی بڑی خوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ وہ جیسے اچھے شاعر ہیں ویسے ہی نثر نگار بھی ہیں ــــ اُن کی مزاح نگاری بھی قابلِ قدر ہے۔ اُن کے بعض انشائیے میں نے پڑھے ہیں اور بے حد محظوظ ہوا ہوں۔ وہ زبان و بیان کا پورا پورا خیال

[illegible]
انداز دل نشین ہے۔ اور اس کو دلچسپ اور پُر اثر بنانے میں طنز کی چٹکیاں بھی شامل رہتی ہیں۔

مزاحیہ انشائیوں کا مجموعہ گونگا درد اردو کے مزاحیہ ادب میں ایک اضافہ ثابت ہوگا۔

یوسف سرمست
ریڈر شعبۂ اردو جامعۂ عثمانیہ

۱۹۸۳ء

ڈاکٹر زینت ساجدہ صاحبہ

ڈاکٹر غیاث صدیقی شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے حیدرآبادی ہیں۔ مگر اس مجموعے کی اشاعت کے بعد وہ نثر نگاروں میں بھی شامل ہو چکے ہیں۔

نثر لکھنا شعر کہنے کے مقابل میں کارِ آساں قرار دیا جاتا ہے ۔ بلکہ لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ نثر لکھنا بھی کیا کوئی فن ہے ؟ غیاث صدیقی چونکہ دونوں میدانوں میں قسمت آزمائی کر چکے ہیں اس لئے وہ شاید کہہ سکیں گے کہ شعر میں سہارا دینے کے لئے بہت سی بیساکھیاں ہوتی ہیں۔ نثر کی دشت نوردی پیدل کرنی پڑتی ہے۔

بات واضح، طریقۂ اظہار دلچسپ اور لہجہ شریفانہ ہو آزادی کے باوجود، الفاظ کا تصرف بے جا نہ ہو۔ زندگی کے ہر پہلو کو دیکھنے، پرکھنے کی صلاحیت ہو۔ اور ایسی ہی بے شمار باتیں۔ تب نثر لکھی جاسکتی ہے

اس مجموعے میں جو چند مضامین شامل ہیں انھیں غیاث کی نثر نگاری کا آغاز سمجھنا چاہیے، کمال یہ نہیں [illegible] مشق [illegible] لیکن باتوں میں سادگی اور موضوعات میں تنوع ہے۔ البتہ بات کرنے میں مزید سلیقے کی ضرورت ہے۔

امکان تو یہی ہے کہ مجموعہ چھپنے کے بعد ان کی ہر دلعزیزی [illegible] نہ سہی، گھائل ضرور ہو جائے گی۔

زینت ساجدہ

۱۹۸۳ء

اشک بن کر تری پلکوں سے ٹپک جاؤں گا
یاد رکھنا مجھے نظروں سے گرانے والے

(غیاث صدیقی)

صفیؔ بھی کس قدر نادان ہے شاعر ہوا تو کیا
اُسے، لوگوں سے، جیتے جی اُمیدِ قدردانی ہے

(حضرت صفیؔ اورنگ آبادی مرحوم)